پہلی لکیر

اشرف شاد

پہلی لکیر

افسانے

اشرف شاد

دوست پبلی کیشنز

اسلام آباد - لاہور - کراچی

ضابطہ

ISBN: 978-969-496-422-5

کتاب	:	پہلی لکیر
مصنف	:	اشرف شاد
موسم اشاعت	:	2011
سرورق	:	خالد رشید
مطبع	:	سن گرافک
قیمت	:	250.00 روپے

دوست پبلی کیشنز
پلاٹ 110، سٹریٹ 15، 2/9-I، اسلام آباد
فون: 85-051-4102784
E-mail: dostpub@nayatel.pk

اپنی پھول جیسی نواسی

'میلان'

کے نام

ترتیب

ناولوں سے اقتباسات

پیش لفظ

مجھے نہیں معلوم کہ مجھے افسانے لکھنے چاہیے تھے یا نہیں۔ مجھے امید ہے کہ قارئین کہانیوں کا یہ مجموعہ پڑھ کر اس سلسلے میں میری رہنمائی کر سکیں گے۔ میرا اپنا خیال یہی تھا کہ ناول کے کھونٹے سے بندھا رہوں، لیکن کچھ کہانیاں دماغ میں گھر کیے بیٹھی تھیں، انھیں باہر کی ہوا کھلانی تھی۔ کچھ اب بھی بن لکھی رہ گئی ہیں، زندگی رہی تو آئندہ!

کہانیاں لکھنے کا موقع اس لیے بھی مل گیا کہ میں ''جج صاحب'' لکھنے کا ارادہ ملتوی کر چکا تھا۔ ۲۰۰۵ء میں صدرِ محترم کی اشاعت کے موقع پر بہت زور شور سے اپنے آئندہ ناول کا اعلان کیا تھا۔ ریسرچ مکمل ہو گئی تھی، پلاٹ ترتیب دے دیا گیا تھا، کردار ڈھونڈ لیے تھے، بحرالکاہل کے اس جزیرے میں بھی وقت گزار آیا تھا جس کے پس منظر میں یہ ناول لکھا جانا تھا، لیکن پھر پاکستان میں عدلیہ کی بحالی کا معاملہ چل پڑا (بلکہ اب تک چل رہا ہے) اور مجھے یہ ڈر دامن گیر ہوا کہ قاری ''جج صاحب'' کے کرداروں میں پاکستان کی سپریم کورٹ کے چہرے تلاش کرنے لگیں گے۔ میرے یہ اوہام اب بھی تازہ ہیں اور گرد بھی ابھی تھمی یا چھٹی نہیں ہے، اسی لیے مناسب یہی سمجھا ہے کہ انتظار کیا جائے۔ انتظار طویل ہوا تو شاید آپ کو کہانیوں اور افسانوں کا ایک اور مجموعہ برداشت کرنا پڑے۔

ناول نگاری ویسے بھی یکسوئی چاہتی ہے، ضروری ہوتا ہے کہ قدم ایک جگہ گڑے ہوں۔ آسٹریلیا

میں تھا تو یہ اطمینان حاصل تھا، اس لیے کم عرصے میں پانچ چھ کتابیں نکل آئیں۔ العین میں پچھلے سات آٹھ برسوں کا قیام آرام دہ تو بہت تھا لیکن یکسوئی نہیں تھی اور زندگی آسٹریلیا، امارات اور پاکستان کے درمیان بٹی ہوئی تھی۔ اپنا خیمہ اکھاڑ کر اب برونائی لے آیا ہوں، یہاں جم کر بیٹھا رہا تو امید ہے کہ ''جج صاحب'' یا کوئی نیا ناول لکھا جاسکے اور اشاعتی مراحل طے کر کے آپ کے ہاتھوں تک پہنچ جائے۔

افسانوں کے اس مجموعے میں شامل صرف دو تین کہانیاں ایسی ہیں جو محترم افتخار امام صدیقی نے ''شاعر'' میں شائع کی تھیں، باقی سب طبع زاد ہیں، موضوعات بھی الگ الگ ہیں۔ ''آپ کہاں سے ہیں؟'' میں ایک نئے وطن میں آبسنے والوں کے شناخت کے مسئلے کو مختلف انداز میں برتا گیا ہے۔ ''عمر کا حساب'' بھی آسٹریلیا کے پس منظر میں لکھی گئی کہانی ہے۔ ''چوتھا کھلاڑی'' اور ''تاریخ کا سبق'' سیاسی کہانیاں ہیں جو بقول ایک بزرگ دوست، ناول جیسے بڑے کینوس پر لکھی گئی ہیں۔ ''ایک کہانی غربت کی'' بھی افسانے کے کینوس سے ذرا باہر نکل آئی ہے۔ ''پیلی لکیر'' حاجی گونگے شاہ کی کہانی ہے لیکن نوعیت اس کی بھی سیاسی ہے۔ لپ اسٹک ایک مختلف طرح کی کہانی ہے جسے ادب کی ایک بہت معتبر شخصیت نے پڑھ کر پسند فرمایا تھا لیکن اس کے انجام کو فحش قرار دیا تھا۔ ''بدلتے زمانے'' اسی تبصرے کا ردِّعمل ہے۔ ''شکیلہ'' نسبتاً پرانی کہانی ہے جو تقریباً بیس سال پہلے سڈنی کی ایک ادبی محفل کے لیے تھائی لینڈ کے پس منظر میں لکھی گئی تھی۔

میں سفرنامے نہیں لکھتا۔ جن ملکوں میں رہا ہوں ان کے تجربے کہانی بنا کر ناولوں میں بیان کر دیتا ہوں۔ ''بے وطن'' میں آسٹریلیا، بحرین اور کویت میں گزرے ہوئے مہہ وسال تھے، ''وزیراعظم'' میں ہنگری کے شہر بڈاپسٹ کی سیر تھی اور ''صدرِ محترم'' میں نیویارک میں گزرا ہوا زمانہ یاد آیا تھا۔ میں اب الگ الگ ''سفر کہانی'' یا ''سفرانے'' لکھنے کی کوشش کر رہا ہوں، یعنی مقامات حقیقی اور کردار اور واقعات افسانوی، اس مجموعے میں شامل ''کاش'' ترکی کے سفر کی ایسی ہی ایک کہانی ہے۔ ''سفرانوں'' کے لیے ایتھوپیا، سری لنکا، فجی، نیپال اور صباح (ملائیشیا) کا سفر بھی کیا تھا۔ کہانیاں بھی تیار ہیں لیکن اب تک لکھی نہیں جاسکی ہیں۔ شاید اگلے کسی مجموعے میں شامل ہوں۔ متحدہ عرب امارات کے قیام کے دوران سوچی گئی کئی کڑوی اور میٹھی کہانیاں بھی ایسے ہی کسی مجموعے کا حصّہ ہوں گی۔

اس مجموعے میں میرے ناولوں کی کچھ ایسی کہانیاں بھی شامل ہیں جو ناول سے الگ کر کے

پڑھی جا سکتی ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ وہ دوست جو میرے ناول پڑھ چکے ہیں، وہ یہ کہانیاں دوبارہ پڑھ کر لطف لے سکیں گے۔

میری کہانی سب سے پہلے یاسمین کی نظر سے گزرتی ہے۔ وہ اسے بیوی نہیں ایک عام قاری کی نگاہ سے پڑھتی ہیں۔ ان کا ردِ عمل کہانی سنوارنے میں میری مدد کرتا ہے۔ میری بیٹی ثمن شاد نے اپنا انگریزی ناول Nationless مکمل کر لیا ہے۔ مجھے فخر ہے کہ وہ مجھ سے کہیں بہتر لکھتی ہیں۔

میں اپنے پبلشر جناب آصف محمود اور ان کے ادارے میں کام کرنے والے ان دوستوں کا شکر گزار ہوں جن کے بغیر اس کتاب کی اشاعت ممکن نہ ہوتی۔

اشرف شاد

برونائی دارالاسلام،

یکم اگست ۲۰۱۱

بحر سے تال تک

اشرف شاد اردو کے ممتاز ناول نگار ہیں۔ پہلے ہی ناول ''بے وطن'' پر اکادمی ادبیات پاکستان کا بہترین ناول کا ایوارڈ حاصل کر چکے ہیں۔ ان کے دیگر ناولوں میں ''وزیر اعظم'' اور ''صدر محترم'' شامل ہیں۔ شاعری کے دو مجموعے ''نصاب'' اور ''آمرے قریب آ'' بھی شائع ہو چکے ہیں۔ اب ''پہلی لکیر'' کے نام سے ان کے افسانوں کا مجموعہ شائع ہو رہا ہے۔

جس طرح عموماً شاعر حضرات مشق سخن کی ابتدا غزل سے کرتے ہیں اسی طرح ہمارے ہاں عام طور پر فکشن رائٹر لکھنے کی ابتداء افسانہ نگاری یا مضمون نگاری سے کرتے ہیں پھر کچھ عرصہ بعد فرصت، توفیق اور دم خم ہو تو ناول کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ میرے خیال میں یہی فطری طریقہ ہے کیوں کہ آدمی تیرنا نہ جانتا ہو تو وہ سیدھا دریا اور سمندر میں چھلانگ نہیں لگا دیتا۔ گہرے پانی میں اترنے سے پہلے کم گہرے پانی یعنی چھوٹے چھوٹے تالابوں، کم گہری نہروں اور سوئمنگ پولز میں تیرنا سیکھتا ہے۔ قدرت نے تیرنا جن کی سرشت میں شامل کر دیا ہو ان کے لیے تالاب اور سمندر کی تخصیص بے معنی ہے۔ مینڈک اور مچھلی کے بچوں کو کون تیرنا سکھاتا ہے۔ کچھوؤں اور مگرمچھوں کے بچے خشکی پر جھاڑیوں کی اوٹ میں دبائے گئے انڈوں سے نکلتے ہی سیدھا پانی کا رخ کرتے ہیں۔ اشرف شاد کی سرشت میں بھی بیان کرنے اور کہانی کہنے کی صلاحیت شامل تھی۔ اسے مختصر کہانیاں لکھ کر مشق کرنے کی ضرورت نہ تھی۔

لیکن اگر وہ ایسا کرتا تو عین ممکن ہے وہ اپنے ناولوں کا بہت سا بوجھ افسانوں میں بانٹ کر سبک دوش ہو جاتا۔ اس نے اس مجموعے میں اپنے ناولوں کے جو چار اقتباسات شامل کیے ہیں وہ بہت حد تک اپنی اپنی جگہ مکمل اور افسانے کی تکنیک کے بہت قریب ہیں۔ اور حالاں کہ میرا خیال تھا کہ ایک عرصہ تک شیروں، ہاتھیوں اور گینڈوں کا شکار کرتے رہنے والے شکاری کو اگر چھوٹے جانوروں اور پرندوں کا شکار کرنا پڑ جائے تو اسے خاصی مشکل پیش آسکتی ہے۔ وہ اگر رائفل استعمال نہ بھی کرے تو بارہ بور کی بندوق میں کبھی کبھی بڑے نمبر کا کارتوس استعمال کرنے سے شکار کو نقصان پہنچنے کا احتمال ہو سکتا ہے لیکن ایسا کہیں نہیں ہوا۔ اشرف شاد اپنے افسانوں میں بھی سرخرو اور کامیاب ٹھہرا۔ غالباً اس نے ناول نگاری کا آغاز کرنے سے پہلے کچھ افسانے لکھ رکھے ہوں گے۔

اس کتاب میں شامل چار ٹکڑے ان کے مختلف ناولوں کے اقتباسات ہیں اس طرح اصل افسانوں کی کل تعداد دس ہے جن میں سے ''چوتھا کھلاڑی'' اور ''تاریخ کا سبق'' سیاسی موضوعات کے افسانے ہیں۔

ہمارے ہاں فکشن میں آمریت اور اس سے پیدا ہونے والی گھٹن اور جبریت پر بہت کچھ لکھا گیا۔ سیاسی بے اعتدالیوں اور بدعنوانیوں کو موضوع بنایا گیا اور سیاست دانوں کے پیدا کیے ہوئے بحرانوں اور قومی نقصانات پر تنقید کی گئی لیکن ہمارے ہاں ادب میں سیاست دانوں اور ڈکٹیٹروں کے اقتدار میں آنے کے طور طریقوں، محلاتی سازشوں اور سیاسی حربوں پر بہت کم لکھا گیا جسے اشرف شاد کے فن پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے جنابِ احمد ندیم قاسمی نے ادیبوں کی تن آسانی سے تعبیر کیا تھا۔ ہمارے ہاں عام طور پر اس کو صحافتی لکھاریوں کا موضوع سمجھ کر نظر انداز کیا گیا۔ میں سمجھتا ہوں کہ اشرف شاد نے ادب میں اس کمی کو پورا کیا ہے۔

''چوتھا کھلاڑی'' ایک ایسا ہی دلچسپ اور فکر انگیز افسانہ ہے۔ تیسری دنیا کے اکثر پسماندہ ممالک کی طرح اسی جزیروں پر مشتمل فیجستان پر جنرل راما کی حکمرانی تھی۔ اس نے فیجستان کی روایت کے مطابق اپنے دوست جنرل ٹوٹو اور جنرل ٹوٹو نے اپنے سب سے قریبی دوست جنرل شوشو کا تختہ الٹ کر اقتدار حاصل کیا تھا اور معزول ہونے والے تینوں صدور ساحل سے اسی میل دور سمندر کے بیچوں بیچ چھوٹے سے ٹیلے نما جزیرے، جس کا اصل نام کچھ اور تھا مگر یہ ''آمرستان'' کے

نام سے معروف ہوا، پر بنائی گئی جیل میں رہتے تھے۔انہیں تمام سہولتیں اور عیش کے سامان میسر تھے لیکن برج کھیلنے کی میز نامکمل تھی اور انہیں چوتھے کھلاڑی جنزل راما کا انتظار تھا جس کا آنا اس ملک کی روایت کے مطابق یقینی تھا۔مگر جنرل راما کو اپنے تاریخی شعور پر بہت فخر تھا اور وہ جانتا تھا کہ فوج کا سربراہ کتنا ہی وفادار ہو، کسی بھی وقت بے وفائی کرسکتا اور آنکھیں پھیر سکتا ہے۔اس لیے اس نے ایک طویل عرصہ تک صدارت کے ساتھ فوج کی سربراہی بھی اپنے ہی پاس رکھی۔لیکن اب ہر طرح سے اطمیناں حاصل کرنے کے بعد اور تاریخ کا سبق بھول کر ایک ماہ پہلے ہی اس نے جنرل انطونو کو افواج کا سربراہ مقرر کیا تھا جو اس کا بھروسے کا آدمی تھا۔

ایک روز فیجستان کے فوجی ہیڈکوارٹر میں عام ڈاک سے آنے والے ایک خط نے سنسنی پھیلا دی۔خط مسلح افواج کے سربراہ جنرل انطونو کے نام آیا اور اس پر ''ذاتی اور صرف آپ کے لیے'' لکھا ہوا تھا۔اس پر پڑوسی ملک موجستان کی مہر اور ٹکٹ لگے ہوئے تھے کیوں کہ ہماری طرح وہ بھی ہر ملکی سازش اور واقعے کا تعلق کسی پڑوسی ملک سے جوڑ دیتے تھے۔اس خط میں جنرل کی آسانی کے لیے ایک تقریر کا ڈرافٹ لکھ کر بھیجا گیا تھا جو اسے اقتدار پر قبضہ کرتے وقت قوم سے خطاب کرنے میں کام آسکتی تھی۔وہی ہماری بارہا دیکھی اور سنی ہوئی تقریروں جیسی ایک تقریر:

''میرے عزیز ہم وطنو اور محبِ وطن فیجستانیو! میں مسلح افواج کا سربراہ جنرل انطونو آپ سے مخاطب ہوں۔کمانڈر انچیف کا حلف اٹھاتے وقت میں نے خود سے یہ عہد کیا تھا کہ ملک کی سیاست سے فوجی مداخلت کی روایت ختم کردوں گا۔اپنے اس عہد پر میں اب بھی قائم ہوں لیکن میں نے اور میرے ساتھیوں نے ملک میں قومی مفاہمت کا حقیقی عمل شروع کرنے کے لیے اہم اقدامات اٹھانے کا فیصلہ کیا ہے۔مجھے خوشی ہے کہ مفاہمت کی راہ ہموار کرنے کے لیے صدر جنرل راما نے میری تجویز پر صدارت سے استعفیٰ دے دیا ہے اور اپنے پرانے ساتھیوں کے پاس حفاظتی پناہ میں رہنے کی تجویز قبول کرلی ہے''۔

جنرل راما بہت سٹپٹایا، غرایا اور اپنے اعتماد کے جنرلوں کو پکارا مگر انہیں کہیں دور ڈیوٹی پر بھیج دیا گیا تھا۔ملٹری سیکرٹری سے کہا کہ اس نے کوئی استعفیٰ نہیں دیا تو اس نے جنرل انطونو کی طرف سے دستخطوں کے لیے بھیجا گیا استعفیٰ اس کے آگے رکھ دیا۔اس طرح معزول صدور کی چوتھے کھلاڑی کی کمی

پوری ہوگئی اور برج کی میز مکمل ہوگئی۔ جنرل انطونو نے صدر جنرل راما کے ساتھ وہی کیا جو ہمارے ہاں جنرل ایوب خان نے گورنر جنرل سکندر مرزا، جنرل یحییٰ خان نے جنرل ایوب خان، جنرل ضیاء الحق نے وزیرِ اعظم ذوالفقار علی بھٹو اور پرویز مشرف نے وزیرِ اعظم محمد نواز شریف کے ساتھ کیا۔ اس لیے یہ کہانی ہمارے ہاں جنرلوں کی اقتدار پر قبضے کی بہت عمدہ تمثیل ہے۔ اندازِ بیان بہت دلچسپ اور ڈرامائی ہے۔

''تاریخ کا سبق'' بھی اسی موضوع پر ایک اور دلچسپ کہانی ہے۔ اس کا مرکزی خیال یہ ہے کہ اقتدار کا بھیڑیا بہت حساس ہوتا ہے۔ اس کے کان پکڑ کر رکھو لیکن اس زور سے نہ کھینچو کہ وہ ناراض ہو کر تمہاری چیر پھاڑ شروع کردے۔ اس میں بھی تاریخ کے سبق کی بات کی گئی ہے اور ایسے بہت سے حوالے دیے گئے ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ تاریخ کا ایک ہی سبق ہے کہ تاریخ سے کوئی سبق نہیں سیکھتا اور اقتدار کے لیے کسی قریبی دوست پر بھی بھروسا نہیں کیا جاسکتا، چاہے وہ کتنا ہی شریف النفس اور نیک شخص ہو۔ اگرچہ نام فرضی ہیں لیکن اس کہانی کا محلِ وقوع پاکستان ہے کیوں کہ اس میں دارالحکومت کا نام جو اقتدار کا گڑھ ہے اور جہاں قومی اسمبلی کے اجلاس ہوتے ہیں، اسلام آباد ہے۔ اس میں گندر بہت طاقت ور اور بادشاہ گر پارٹی لیڈر ہے مگر اپنے دوست اور کلاس فیلو جمال عزیزی کے برعکس تاریخ سے کوئی سبق سیکھنے کو تیار نہیں۔ وہ وزیرِ اعظم شاہانی کو ہٹانے اور خود اقتدار سنبھالنے کے لیے رکنِ قومی اسمبلی جمال عزیزی کو اصرار کر کے عبوری دور کے لیے وزیرِ اعظم نامزد کرتا ہے اور اس طرح تاریخ کے جبر اور اقتدار کے بھیڑیے کی زد میں آجاتا ہے۔ اس کہانی کا اختتام بھی نہایت دلچسپ اور ڈرامائی طریقے سے ہوتا ہے اور یہ بہت عمدہ طریقے اور سلیقے سے سیاست اور اقتدار کے ایوانوں میں ہونے والی سازشوں اور جوڑتوڑ کی عکاسی کرتی ہے۔

ان دونوں کہانیاں کو افسانے کا پیراہن پورا تو آجاتا ہے لیکن ذرا تنگ محسوس ہوتا رہتا ہے۔ اس تنگی کا خود مصنف کو بھی ادراک ہے اور اس نے پیش لفظ میں کہا ہے کہ بقول ایک بزرگ دوست کے یہ ناول جیسے بڑے کینوس پر لکھی گئی کہانیاں ہیں۔ مگر تفصیل نگاری کے باوجود دونوں کہانیوں کا اختتام اور تاثر مختصر افسانے کا ہی ہے یا پھر زیادہ سے زیادہ انہیں طویل مختصر افسانے کہا جا سکتا ہے، ناولٹ یا ناویلا ہرگز نہیں۔ ''ایک کہانی غربت کی'' بھی تکنیکی لحاظ سے ایسی ہی ایک کہانی ہے مگر اس کا موضوع بالکل الگ ہے۔ اس میں آپ بیتی کا تاثر اور کچھ عناصر بھی پائے جاتے ہیں۔ لیکن اس سے کیا فرق

پڑتا ہے بلکہ میں سمجھتا ہوں تاثر گہرا ہو جاتا ہے۔ یہ ایک ذہین شخص کی غربت کے خلاف جدوجہد کی عمدہ کہانی ہے۔

''آپ کہاں سے ہیں ؟'' میں نئے ملک میں آ کر بسنے والوں کی شناخت کو موضوع بنایا گیا ہے۔ جن لوگوں سے آپ کو کچھ لینا دینا نہ ہو ان سے آپ بے اعتنائی برت سکتے ہیں لیکن حسن و جمال کا جادو اور خوب صورتی اپنی الگ منطق رکھتے ہیں۔ آپ انہیں نظرانداز کر سکتے ہیں نہ ہی ان سے بے اعتنائی روا رکھ سکتے ہیں۔ اس میں ایک شاعر نزار شہبانی کی جس کا تعلق عراق سے ہے بہت عمدہ کردار نگاری کی گئی ہے۔ اسے اس سوال سے بڑی چڑ ہے کہ آپ کہاں کے ہیں اور وہ یہ سوال پوچھنے والے کو بری طرح ڈانٹ دیتا بلکہ اس کے خلاف نسلی تعصب کا مقدمہ دائر کرنے کی دھمکی دے دیتا ہے۔ لیکن ایک نہایت حسین خاتون ٹیکسی ڈرائیور کو دیکھ کر بے اختیار اسے پوچھ بیٹھتا ہے کہ وہ کہاں سے ہے اور جب وہ بتاتی ہے کہ اس کا تعلق عراق سے ہے تو وہ بھی نہایت فخر سے اسے بتاتا ہے کہ میں بھی۔

''پہلی لکیر''، فیکٹس اور فکشن کی آمیزش سے لکھا ہوا ایک اہم افسانہ ہے۔ جس کا لوکیل مقبوضہ کشمیر اور اس میں جو واقعہ ۲۰۰۰ء میں پیش آیا اس کا احوال وقوع پذیر ہونے کے پچاس برس بعد ۲۰۵۰ء میں پس منظر کے طور پر لکھا گیا ہے۔ اس میں مرکزی کردار حاجی گونگے شاہ کا کردار نہایت خوب صورتی سے بُنا گیا ہے۔ مقبوضہ کشمیر کے سرد موسم اور پہاڑی بود و باش کا بھی بہت عمدگی سے ذکر ہوا ہے۔ اس کا موضوع اور مرکزی خیال منٹو کے ''ٹوبہ ٹیک سنگھ'' سے ملتا جلتا ہے۔ بشن سنگھ کی طرح حاجی گونگے شاہ بھی اس کنٹرول لائن اور سرحد کو نہیں مانتا جو انسانوں اور کنبوں کو تقسیم کرتی اور جس پر بہت خون بہہ چکا ہے۔ اسے بھی کنٹرول لائن کے اسی مقام پر دفنا دیا گیا جہاں اس کی لاش گری تھی اور اقوامِ متحدہ کی امن فوج کے زیرِ انتظام سرحد کے دونوں طرف ہر سال اس کی قبر پر پھولوں کی چادر چڑھائی جاتی ہے۔

''کاش'' ترکی کے پس منظر میں لکھی گئی کہانی ہے جس میں سفرنامے کا بہت سا مواد برتا گیا ہے۔ مصنف نے خود بھی وضاحت کی ہے کہ اس کے مقامات حقیقی اور کردار اور واقعات افسانوی ہیں۔ اس کا اختتام خاص طور پر نہایت عمدہ اور افسانوی ہے۔ سفرنامے کے مواد پر مشتمل ایک اور کہانی ''شکیلہ'' ہے جو تھائی لینڈ کے پس منظر میں لکھی گئی ہے۔ اس میں تھائی لینڈ کی بود و باش کو بہت تفصیل

اور عمدگی سے پیش کیا گیا ہے۔ عورت ذات کو کموڈٹی بنا دینے اور نسوانیت کی تذلیل کے دل خراش مناظر کے ساتھ ساتھ اس میں ایک مسلم عورت میوعرف شکیلہ کا کردار اس علاقے کے حالات اور معاشرت کو سمجھنے میں خاصی مدد دیتا ہے۔

''لپ اسٹک'' ایک مختلف ذائقے کی اور نفسیاتی کہانی ہے۔ ایک نوجوان لڑکی کو لپ اسٹک سے کراہت آتی ہے۔ یہاں تک کہ وہ شادی کے موقع پر بھی لپ اسٹک لگاتی ہے نہ لگانے دیتی ہے۔ یہ بات سارے خاندان اور برادری میں معمہ بنی رہتی ہے تا آنکہ اپنے شوہر کے اصرار پر وہ بتاتی ہے کہ اس کراہت کا تعلق اس کے لڑکپن کے ایک واقعے سے ہے۔ غالباً یہی وہ کہانی ہے جس کو پڑھ کر ان کی ایک اور کہانی ''بدلتے زمانے'' کے ایک افسانہ نگار ایڈیٹر ''کاظمی صاحب'' بدک گئے تھے اور اسے فحش قرار دے دیا تھا کیوں کہ انہوں نے آج تک کسی عورت کو، اپنی بیوی تک کو بے لباس نہیں دیکھا تھا مگر کچھ دنوں بعد جب انہوں نے اپنے پوتے کے کمپیوٹر پر عریاں بدنوں کی بہار دیکھی تو انہیں باور آیا کہ زمانہ واقعی بہت بدل گیا تھا۔

اشرف شاد کے ناولوں کی طرح ان کے افسانے بھی محض حالات و واقعات کی عکاسی تک محدود نہیں بلکہ ان میں اپنے ملک اور معاشرے کو درپیش ہر خطرے، مسئلے اور معروضی صورتِ احوال کا حقیقت پسندی کے نقطۂ نظر سے جائزہ لیا گیا ہے اور اس پر نہایت سچائی، بالغ نظری اور دانشوری سے اپنی رائے دی گئی ہے۔ ان کی سیاسی، تاریخی اور سماجی معلومات حیران کن ہیں۔ ان افسانوں اور ناول کے ٹکڑوں کی سب سے بڑی خوبی ان کی ریڈا ایبلٹی اور موضوعات کا تنوع ہے۔ یہ بات باعثِ مسرت ہے کہ اردو کے ایک نامور ناول نگار نے شہرت و مقبولیت حاصل کرنے کے بعد بھی افسانے کی اہمیت کو تسلیم کیا ہے۔ مجھے تو ان کا یہ ادبی سفر سمندر سے تال کی طرف مراجعت کا سفر معلوم ہوا۔

منشا یاد

۲۵ اگست ۲۰۱۱، اسلام آباد

چوتھا کھلاڑی

فیجستان کے فوجی ہیڈکوارٹر میں عام ڈاک سے آنے والے ایک خط نے سنسنی پھیلادی تھی۔ خط مسلح افواج کے سربراہ جنرل انطونو کے نام تھا اور اس پر جلی حرفوں میں ''ذاتی'' اور ''صرف آپ کے لیے'' تحریر تھا۔ فوج کے سربراہ کے نام ذاتی خط آنا کوئی غیر معمولی بات نہیں تھی۔ فیجستان کے اسّی میں سے اکثر جزیرے ابھی تک پس ماندہ تھے، خاص طور پر دور دراز کے چھوٹے جزیرے جن میں سے ایک جزیرے سے جنرل انطونو کا بھی تعلق تھا اور جہاں فون اور انٹرنیٹ نہ ہونے کی وجہ سے رابطے کے لیے اب بھی کچھوے کی طرح رینگنے والی بحری ڈاک استعمال ہوتی تھی۔

لیکن دو باتیں ایسی تھیں کہ خط مشکوک قرار پایا تھا۔ ایک تو اس پر بھیجنے والے کا نام نہیں تھا اور دوسرے اس پر پڑوس کے جزائری ملک موجستان کے ٹکٹ اور وہیں کی مہر لگی تھی۔ موجستان میں جنرل انطونو کا کوئی جاننے والا تھا نہ رشتے دار اور نہ ہی وہاں کسی ہم رتبہ فوجی افسر سے اس کے ذاتی مراسم بن پائے تھے۔ جنرل انطونو نے صرف ایک ماہ پہلے ہی صدر جنرل راما سے فوج کے سربراہ کا چارج لیا تھا۔ فوج کے سابق مردِ آہن اور صدر جنرل راما نے کئی سال تک صدارت کے ساتھ فوج کی سربراہی بھی اپنے پاس رکھی تھی اور اب ہر طرف سے اطمینان حاصل ہونے کے بعد جنرل انطونو کو فوجی اختیار کی لکڑی تھما دی تھی۔

صدر جنرل راما کے بعض خیرخواہ اس فیصلے پر کسمسائے تھے لیکن کچھ بول نہیں سکے تھے۔ ان کے تحفظات کی وجہ واضح تھی۔ فیجستان میں طاقت کا سرچشمہ فوجی سربراہ کی کرسی تھی اور اس کرسی پر بیٹھنے والے کے بارے یہ کہنا مشکل تھا کہ وہ کیا کرے گا۔ وہ کچھ بھی کر سکتا تھا۔ فیجستان کی روایت یہی تھی۔ جنرل راما نے اپنے دوست جنرل ٹوٹو اور جنرل ٹوٹو نے اپنے سب سے قریبی دوست جنرل شوشو کا تختہ الٹ کر اقتدار حاصل کیا تھا۔ اس سے پہلے کی تاریخ بھی یہی تھی۔ فیجستان کے اسکولوں میں پڑھائی جانے والی تاریخ کی کتابوں کو بار بار بدلنا پڑا تھا۔ لیکن اب چند سالوں سے ایک ہی سبق چل رہا تھا۔ بچوں کو تاریخ کا یہ ایک سطری سبق اچھی طرح رٹ گیا تھا۔ جنرل راما نے جنرل ٹوٹو کا، جنرل ٹوٹو نے جنرل شوشو کا اور جنرل شوشو نے جنرل موموکا تختہ الٹا تھا۔ اس سے پہلے کی تاریخ نوآبادیاتی آقاؤں کی تاریخ تھی جسے یاد رکھنا ضروری نہیں تھا۔

معزول ہونے والے تینوں سابق صدور ساحل سے اسی میل دور سمندر کے بیچوں بیچ چھوٹے سے ٹیلے نما جزیرے پر بنائی گئی جیل میں رہتے تھے جہاں تمام سہولتیں اور عیش کے سب سامان میسر تھے۔ جزیرے کا نام کچھ اور تھا لیکن فیجستانی اسے آمرستان کے نام سے پہچانتے تھے۔ فیجستان میں یہ مذاق بھی عام تھا کہ تینوں برطرف شدہ صدر، جنرل راما کے آنے کا بے چینی سے انتظار کر رہے تھے تاکہ برج کھیلنے کے لیے ان کی میز مکمل ہو سکے۔ دس سال گزرنے کے بعد بھی چوتھے کھلاڑی کے لیے ان کا انتظار ختم نہیں ہوا تھا۔ یہ مذاق صدر جنرل راما تک بھی پہنچا تھا اور وہ دل ہی دل میں مسکرایا تھا۔

''چوتھا کھلاڑی برج نہیں کھیلے گا۔ وہ تینوں بوڑھے جنرلوں کو رگبی سکھائے گا۔'' صدر جنرل راما نے قہقہہ لگا کر کرنل بروٹا سے کہا تھا جو پہلے صدر جنرل راما کا اور اب نئے فوجی سربراہ جنرل انطونو کا ملٹری سیکرٹری تھا اور صدر جنرل راما کی چوکھٹ پر ہر شام حاضری دے کر اپنی وفاداری کا ثبوت دیتا تھا۔

صدر جنرل راما کو اپنے تاریخی شعور پر بہت فخر تھا۔ اسے بھی پتا تھا کہ فوج کا سربراہ کتنا بھی وفادار ہو، بے وفائی کر سکتا ہے۔ لیکن صدر جنرل راما کو صرف اپنے تاریخی شعور پر ہی فخر نہیں تھا، اسے یہ بھی گھمنڈ تھا کہ وہ تاریخ بدلنے پر قادر ہے۔ اس نے پکا بندوبست کیا تھا کہ اگر جنرل انطونو اسے معزول کرنے کی کوشش کرے گا تو کس طرح کھڑے کھڑے اُسے برطرف کیا جا سکے گا۔ صدر جنرل راما کو یقین تھا کہ جنرل انطونو آنکھیں نہیں پھیرے گا۔ اس میں بے وفائی کرنے کی صلاحیت نہیں تھی۔ وہ برج

کا نہیں رگبی کا کھلاڑی تھا۔ پھر بھی صدر جنرل راما نے احتیاطاً فوج کے کلیدی عہدوں پر اپنے پرانے وفاداروں اور ہم قبیلہ جنرلوں کو مقرر کیا تھا۔ خاص طور پر دارالحکومت کی کمان جنرل کموکا کے پاس تھی جو ہم قبیلہ ہی نہیں رشتے دار بھی تھا۔ جنرل انطونو کے پاس ہلنے کی گنجائش نہیں تھی۔ کوشش کرتا بھی تو جنرل کموکا صدر کے حکم پر اسے کشتی میں بٹھا کر چوتھا کھلاڑی بننے آمرستان بھیج سکتا تھا۔

تاریخ کا شعور رکھنے والے صدر کو یہ بھی معلوم تھا کہ برسوں ایک ہی شکل دیکھتے دیکھتے لوگ بیزار ہو گئے تھے۔ اسی لیے اس نے وردی اتار کر اپنی تشکیلِ نو کی تھی اور فوجی سربراہ کا عہدہ چھوڑنے کے بعد صرف قومی لباس پہنتا تھا۔ نیلے اور ہرے رنگ کے چوڑے چارخانے والی اسکرٹ اور بند گلے کی سفید کلف دار قمیص۔ فوجی ٹوپی اترنے سے اس کے کانٹوں جیسے سخت اور سفید ہوتے ہوئے گھنگریالے بالوں نے اس کی ظاہری ہیئت کچھ حد تک بدل دی تھی، لیکن چہرہ وہی تھا۔ زیادہ بولنے اور ایک ہی تقریر بار بار دہرانے کی عادت بھی وہی تھی۔ عوام کی بے زاری کم نہیں ہوئی تھی۔ فیجستان میں بے چینی کرنٹ بن کر دوڑ رہی تھی۔ دور دراز واقع کچھ جزیرے تو بغاوت کی دھمکیاں بھی دینے لگے تھے۔ صدر کو پروا نہیں تھی۔ اس کے لیے یہ سب کچھ مچھروں کی بھن بھناہٹ تھی۔ جب تک فوج اس کے ساتھ تھی وہ یہ آوازیں بارود کے دھماکوں میں دفن کر سکتا تھا۔

فوج کے نئے سربراہ جنرل انطونو کے نام آنے والے خط سے پھیلنے والی سنسنی کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ صدر جنرل راما کی فوجی سربراہی کے دور میں اس کے نام دو لیٹر بم آ چکے تھے۔ ایک نے صرف ہلکا سا دھواں چھوڑا تھا اور دوسرے خط میں تھوڑا سا باریک سفوف تھا جو ملٹری سیکرٹری کرنل برونا کے ہاتھ پر پٹاخے کی طرح پھٹا تھا۔ لیکن کوئی نقصان نہیں ہوا تھا صرف کرنل برونا کا ہاتھ ہلکا سا جھلس گیا تھا۔ اس کے بدلے وہ سرکاری خرچ پر ہوائستان میں ایک مہینے کی شان دار چھٹیاں گزار کر آیا تھا۔

ان خط بموں کے بعد فوجی ہیڈ کوارٹر میں ایک نظام ترتیب دے دیا گیا تھا اور فوج کے سربراہ کے نام آنے والے مشکوک خط ایک طویل حفاظتی عمل سے گزرتے تھے۔ موجستان سے آنے والا یہ خط بھی ماہرین کے معائنے کے لیے خاص طور پر بنائے گئے آہنی کمرے میں فولادی میز پر رکھ دیا گیا۔ ماہرین بم پروف لباس، منہ پر گیس ماسک اور ہاتھوں میں بھاری حفاظتی دستانے پہن کر آئے تھے۔ انھوں نے لفافے کو روشنی کی زد پر رکھ کر دیکھا۔ اندر صرف تہہ کیے ہوئے کاغذ تھے۔ سفوف یا کوئی اور

مادّہ نظر نہیں آیا۔ ماہرین پھر بھی محتاط تھے۔ کاغذ میں زہریلے، خطرناک اور نظر نہ آنے والے بیکٹیریا ہو سکتے تھے جو کاغذ کی تہہ کھلتے ہی سانس کے ذریعے ناک میں گھس کر بدن پھاڑ سکتے تھے۔ کوئی ریڈیائی لہر بھی ملفوف ہو سکتی تھی۔

ماہرین نے بہت احتیاط سے جراثیم سے پاک اسٹیل کے چاقو سے لفافہ چاک کیا، اندر سے کاغذ نکال کر اس کی دوہری تہہ کھولی اور شیشے کا ایک شفاف ٹکڑا کاغذ پر رگڑ کر اسے کمرے میں موجود خوردبینوں سے دیکھا۔ کوئی خطرناک جرثومہ اور بیکٹیریا نظر نہیں آیا تو ماہرین نے اطمینان کی سانس لی اور چہرے سے ماسک اور جسم سے بم پروف لباس اتار دیا۔ اب فنگر پرنٹس کے ماہرین کی باری تھی جنہوں نے لفافے پر موجود انگلیوں کے نشانات کی تصویریں اتاریں۔ لفافے کے اندر سے نکلنے والے خط پر کسی انگلی کا کوئی نشان نہیں تھا۔

''خط لکھنے والا بہت ہوشیار تھا۔ اس نے ربر کے باریک دستانے پہن کر سارا کام کیا ہے۔'' ایک ماہر نے فیصلہ سنایا۔

اسی شام نیشنل ڈیٹا بینک میں لفافے پر پائے گئے نشانوں کی جانچ ہوئی۔ جو نشانات میچ ہوئے وہ فیجستان کے ڈاک خانے کے ملازمین کے تھے۔ جو نشانات میچ نہیں ہوئے وہ انٹرنیٹ کے ذریعے موجستان بھیج دیے گئے۔ رات گئے ان کا نتیجہ بھی آ گیا۔ یہ سب نشانات بھی موجستان کے ڈاک خانے کے ملازمین کے تھے۔ ان کے علاوہ کوئی اجنبی نشانِ انگشت نہیں تھا۔

''خط بھیجنے والے نے خط پوسٹ کرتے ہوئے بھی دستانے نہیں اتارے۔'' ایک اور ماہر نے کہا جس کے بعد جانچ ختم ہوئی اور خط بے ضرر قرار دے کر جنرل انطونو کے ملٹری سیکرٹری، کرنل بروٹا کے حوالے کر دیا گیا۔

کرنل بروٹا جب دوسری صبح حسبِ معمول جنرل انطونو کے کمرے میں آیا تو جنرل انطونو کافی کا دوسرا کپ اور آدھا سگار ختم کر چکا تھا۔ کرنل بروٹا نے اس روز کی مصروفیات بتانے سے پہلے ہمیشہ کی طرح گزشتہ روز کے رگبی میچوں کے نتائج سنائے۔ یہ کرنل بروٹا کے فرائض میں شامل تھا۔ فیجستانی رگبی سے جنون کی حد تک محبت کرتے تھے اور سگار نوشی کی طرح رگبی سے جنرل انطونو کا عشق بھی مشہور تھا۔ نوجوانی میں وہ خود بھی رگبی کا کھلاڑی رہا تھا۔ اس کے دوستوں کا خیال تھا کہ جنرل انطونو اگر فوج

میں نہ جاتا تو رگبی کا پیشہ ور کھلاڑی بن کر زیادہ دولت اور دنیا میں بڑا نام کما سکتا تھا۔

کرنل برونا نے جب آج کی ملاقاتوں والا کاغذ پڑھنا شروع کیا تو جنرل انطونو نے اسے ہاتھ اٹھا کر روک دیا۔

''میرے نام آنے والا خط کہاں ہے؟''

''میں بتانے ہی والا تھا۔'' کرنل برونا نے فائل میں کاغذات الٹ پلٹ کرتے ہوئے کہا۔ اسے حیرت ہوئی تھی کہ جنرل انطونو کو کیسے معلوم ہوا۔ جب حفاظتی کمرے میں خط کی جانچ ہو رہی تھی، جنرل انطونو ایک قریبی جزیرے کے فوجی گیریسن میں فوجی کمانڈروں کے ساتھ ڈنر کھا رہا تھا اور رات گئے واپس آیا تھا۔ کرنل برونا کا خیال تھا خط کی کہانی اس کی اپنی ذات سے آگے نہیں بڑھی تھی۔

''کسی نے آپ کے لیے تقریر لکھ کر بھیجی ہے۔'' کرنل برونا نے مسکراتے ہوئے کہا اور جنرل انطونو کا اشارہ پا کر خط پڑھنا شروع کر دیا۔

''عزت مآب جنرل انطونو! فیجستان کے غریب عوام کو یقین ہے کہ آپ ملک کو جمہوریت کی راہ پر گام زن کرنے میں اپنا کردار ادا کریں گے۔ لیکن ممکن ہے جب آپ یہ فیصلہ کن قدم اٹھانے جائیں تو آپ کے پاس تقریر لکھنے یا لکھوانے کا وقت نہ ہو۔ میں تقریر لکھ کر بھیج رہا ہوں تا کہ ایسی کسی ایمرجنسی میں اور بوقتِ ضرورت آپ اسے استعمال کر سکیں۔ آپ کا ایک پرستار۔''

کرنل برونا کا انداز مذاق اڑانے والا تھا۔ پڑھنے کے بعد مسکرایا بھی تھا۔ لیکن جنرل انطونو پہلے کی طرح سنجیدہ اور خاموش تھا۔ اس نے سگار سلگا کر ایک گہرا کش لیا اور کرنل برونا کو دیکھا جس نے اشارہ سمجھ کر تقریر پڑھنا شروع کی۔

''میرے عزیز ہم وطنو اور محبِ وطن فیجستانیو! میں مسلّح افواج کا سربراہ جنرل انطونو آپ سے مخاطب ہوں۔ کمانڈر انچیف کا حلف اٹھاتے وقت میں نے خود سے یہ عہد کیا تھا کہ ملک کی سیاست سے فوجی مداخلت کی روایت ختم کر دوں گا۔ اپنے اس عہد پر میں اب بھی قائم ہوں لیکن میں نے اور میرے ساتھیوں نے ملک میں قومی مفاہمت کا حقیقی عمل شروع کرنے کے لیے اہم اقدامات اٹھانے کا فیصلہ کیا ہے۔ مجھے خوشی ہے کہ مفاہمت کی راہ ہموار کرنے کے لیے صدر جنرل راما نے میری تجویز پر صدارت سے استعفیٰ دے دیا ہے اور اپنے پرانے ساتھیوں کے پاس حفاظتی پناہ میں رہنے کی تجویز قبول

کر لی ہے۔ میں نے قبائلی سرداروں کی کمیٹی کے چیف ڈاکٹر بتو کا کو صدر بننے اور قومی حکومت تشکیل دینے کی دعوت دی ہے۔ میں نے فیصلہ کیا ہے کہ......''

''بس!'' جنرل انطونو نے ہاتھ کے اشارے سے اسے روک دیا۔

''آج کے اپائنٹمنٹس کی تفصیل!''

کرنل بروٹا نے اطمینان کا سانس لیا اور تقریر کا کاغذ موڑ کر فائل میں رکھنے لگا۔

''یہ میرا ذاتی خط ہے، مجھے دے دیجیے۔'' جنرل انطونو نے ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا۔ کرنل بروٹا نے اسے حیرت دیکھا اور خاموشی سے خط اور تقریر جنرل انطونو کو دے دیے۔ جنرل انطونو نے کاغذ لے کر اپنی دراز میں رکھ لیے اور کرنل بروٹا سے اس دن کی مصروفیات کی تفصیل سننے لگا۔

اس شام ایوانِ صدر میں مختلف جزیروں کے قبائلی بڑوں کے لیے ڈنر کا اہتمام تھا جو جنرل راما کو تاحیات صدر بنانے کی درخواست لے کر آئے تھے۔ سب کھانے کے مرکزی ہال میں جمع ہو کر صدر راما کے آنے کا انتظار کر رہے تھے۔ صدر راما اپنی اسٹڈی میں سپہ سالار جنرل انطونو کے ساتھ بیٹھا تھا جو رگبی کا میچ دیکھ کر ڈنر میں شریک ہونے سیدھا ایوانِ صدر آیا تھا اور ابھی تک ایک دوسرے سے ٹکراتے اور گیند لے کر بھاگتے ہوئے اپنے پسندیدہ کھلاڑیوں کے خیالوں میں گم تھا۔ اسے اپنا وہ آخری میچ یاد آ رہا تھا جب وہ گرینڈ فائنل میں گیند لے کر تیر کی طرح مخالف گول کی طرف دوڑا تھا اور پورا اسٹیڈیم ٹونی! ٹونی! کے نعروں سے گونج اٹھا تھا۔

''سنا ہے آپ کو کسی نے تقریر لکھ کر بھیجی ہے؟'' صدر راما نے مسکرا کر کہا تو وہ اپنے خیالوں سے چونک پڑا۔

''کوئی سرپھرا تھا۔'' جنرل انطونو نے گیند لے کر دوڑتے ہوئے مخالف کھلاڑی کو ڈاج دیا۔

''سرپھروں کے خط دراز میں نہ رکھیے۔ سچ مچ کا بم بن کر پھٹ جائیں گے۔'' صدر جنرل راما نے قہقہہ لگا کر اپنے پتے کھول دیے۔ جنرل انطونو کو لگا مخالف کھلاڑی اس سے بچ کر گیند لے بھاگا ہے۔ وہ کچھ نہیں بولا بس اندر ہی اندر کھولتا رہا کہ کرنل بروٹا اب بھی اس کا نہیں صدر جنرل راما کا وفادار اور خبری تھا۔

''آیئے کھانے پر انتظار ہو رہا ہے۔'' صدر جنرل راما نے سگاردان سے ایک سگار منتخب کر کے

اٹھتے ہوئے کہا۔ اس نے جنرل انطونو کو بھی سگار پیش کیا لیکن اس نے شکریے کے ساتھ انکار کر دیا۔ صدر راما کو حیرت ہوئی۔ جنرل انطونو نے اس سے پہلے سگار لینے سے منع نہیں کیا تھا۔

کھانے کے ہال میں داخل ہوتے وقت صدر راما نے جنرل انطونو کے کندھے پر سرپرستانہ انداز میں ہاتھ رکھ کر اسے اپنے قریب کر لیا تھا۔ کیمرہ مین اور فوٹو گرافروں کی فلیش لائٹس چمکی تھیں۔ جنرل انطونو کسمسایا لیکن جنرل راما کی گرفت سے آزاد نہیں ہو پایا۔ اسے پتا تھا صبح کے اخباروں میں چھپنے والی یہ تصویر اس بات کی شہادت بن جائے گی کہ فوج کا سربراہ جنرل انطونو پوری طرح صدر راما کے چنگل میں ہے۔ جنرل انطونو کو اب ڈنر ختم ہونے کی جلدی تھی۔ اسے واپس جا کر اپنے گول کا دفاع کرنا تھا۔

دوسری صبح کرنل بروتا معمول کے مطابق جنرل انطونو کے دفتر میں داخل ہوا تو جنرل انطونو نے اسے بیٹھنے کے لیے نہیں کہا اور سر جھکائے فائل پڑھنے میں مصروف رہا۔ کرنل بروتا خاموش کھڑا اسے حیرت سے دیکھتا رہا۔

''فائل میز پر چھوڑ دیجیے۔'' جنرل انطونو نے کچھ دیر بعد سر اٹھا کر کہا۔ ''میں نے کرنل فوفو کو اپنا نیا ملٹری سیکرٹری مقرر کیا ہے۔ اپنی نئی پوسٹنگ کے لیے آپ لنچ کے بعد مجھ سے ملیے۔''

''سر......!'' کرنل بروتا نے کچھ کہنا چاہا لیکن جنرل انطونو نے سر دوبارہ فائل پر جھکا دیا۔

کرنل بروتا نے ڈھیلے ہاتھوں سے سلوٹ کیا اور باہر چل دیا۔ دروازے سے اس کی جگہ لینے والا نیا ملٹری سیکرٹری کرنل فوفو داخل ہو رہا تھا۔ کرنل بروتا نے سوچا اس سے اندازے کی بہت بڑی غلطی ہوئی تھی۔ طاقت کا سرچشمہ بدلا نہیں تھا۔ یہ رگبی کھیلنے کا وقت تھا اور وہ اب تک برج کے کھلاڑی پر شرط لگائے ہوئے تھا۔ کرنل بروتا دماغ پر زور دے کر رگبی کے پرانے سبق یاد کرنے لگا۔ کالج کے زمانے میں وہ بھی رگبی کھیل چکا تھا۔ اسے پتا تھا کہ رگبی میں برج کے کھیل کی طرح سوچنے کا وقت نہیں ہوتا، صرف ایکشن ہوتا ہے۔ کرنل بروتا کو ریزرو کھلاڑی بن کر بینچ پر بیٹھنا پسند نہیں تھا۔

کرنل بروتا اپنے معمول کے مطابق شام گئے ایوانِ صدر میں جنرل راما کے سامنے حاضر تھا جو اپنی اسٹڈی میں اکیلا بیٹھا فائلیں اور ٹی وی کی خبریں دیکھ رہا تھا۔ کرنل بروتا نے کھڑے کھڑے ملٹری سیکرٹری کے عہدے سے اپنی برطرفی کی خبر سنائی۔ اسے صدر جنرل راما کے سامنے بیٹھنے کی اجازت نہیں تھی۔

''مجھ سے پوچھے بغیر؟'' صدر راما نے حیرت سے کہا۔ ساتھ ہی اس کا پارہ ایک دم چڑھ گیا۔

''ٹونی کو میرے آدمی کے تبادلے کی ہمت کیسے ہوئی۔ اسے فون ملاؤ۔''

''سر! وہ رگبی کا فائنل دیکھنے گئے ہوئے تھے۔''

''بلاڈی رگبی! جنرل کموکا کو فون لگاؤ۔''

''سر! جنرل کموکا کو صبح سویرے ہی شمالی جزیرے بھیج دیا گیا ہے جہاں سے بغاوت کی خبریں آ رہی تھیں۔''

''مجھ سے پوچھے بغیر؟'' صدر جنرل راما غصے میں اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ ''میں اسے برطرف کر کے غداری کے الزام میں اس کی بوٹیاں کتوں سے نچوادوں گا۔ دوسرے جنرلوں کو فون لگاؤ۔ جنرل، جوجو، جنرل بوبو، جنرل دودو......''

''سر! وہ تینوں بھی جنرل کموکا کے ساتھ گئے ہیں۔ شمالی جزیرے میں شورش شدید ہے۔''

صدر جنرل راما جھاگ کی طرح اپنے صوفے پر بیٹھ گیا۔ چھٹی حس الارم بجانے لگی تھی۔

''لیکن اتنی جلدی۔ صرف ایک مہینے کے اندر......'' اس کے دماغ میں بگولے گھوم رہے تھے۔ وہ خالی نظروں سے کرنل برونا کو دیکھ رہا تھا جو اسی طرح اٹینشن کھڑا تھا۔

''میچ ختم ہو گیا ہو گا۔'' صدر راما نے گھڑی دیکھ کر کہا۔ ''جنرل انطونو کو فون ملاؤ۔'' اس نے اس بار جنرل انطونو کو ٹونی نہیں کہا تھا۔

کرنل برونا اپنی جگہ سے نہیں ہلا۔ روبوٹ بنا اٹینشن کھڑا رہا۔ اسی وقت ٹی وی پر فیجستان کا قومی ترانہ بجنے لگا۔ صدر جنرل راما خود کار طریقے سے کھڑا ہو گیا لیکن چہرہ سفید ہو گیا تھا۔ ترانے کے بعد ٹی وی اسکرین پر جنرل انطونو نمودار ہوا۔ وہ اپنی مکمل یونیفارم میں قوم سے خطاب کر رہا تھا۔

''میرے عزیز ہم وطنو اور محب وطن فیجستانیو! میں مسلح افواج کا سربراہ جنرل انطونو آپ سے مخاطب ہوں۔ کمانڈر انچیف کا حلف اٹھاتے وقت میں نے خود سے عہد کیا تھا کہ......''

''کیا یہ وہی تقریر ہے......؟'' صدر جنرل راما نے ٹی وی کی اسکرین سے نظریں ہٹا کر کرنل برونا سے پوچھا۔ اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ صدر راما نے اپنی توجہ دوبارہ ٹی وی کی طرف کر لی جہاں جنرل انطونو کی آواز گونج رہی تھی۔

''......قومی مفاہمت کی راہ ہموار کرنے کے لیے صدر جنرل راما نے صدارت سے استعفیٰ دے دیا ہے اور......''

''کیا بکواس ہے۔ میں نے کوئی استعفیٰ نہیں دیا۔'' صدر راما غصے سے چیخا۔ ''میں اب بھی صدر ہوں۔ میں نے استعفیٰ نہیں دیا۔ میں غداری کے الزام میں کتوں سے اس کی......''

''سر یہ آپ کا استعفیٰ ہے۔ عزت مآب جنرل انطونو نے آپ کے دستخط کے لیے بھیجا ہے۔'' کرنل برونا نے ایک کاغذ صدر جنرل راما کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

''برونا......تو......!!''

''سر! مجھے ترقی دے کر جنرل کموکا کی جگہ دارالحکومت کا فوجی کمانڈر مقرر کیا گیا ہے۔ میرا فوجی دستہ باہر آپ کا انتظار کر رہا ہے۔ بوٹ آپ کو لے جانے کے لیے تیار ہے۔''

جنرل راما دیر تک کرنل برونا کو دیکھتا رہا۔ وہ جان گیا تھا کہ وہ بازی ہار گیا ہے۔ اس نے اپنے پتے پھینک دیے اور کرنل برونا سے کاغذ لے کر دستخط کرنے کے لیے جیب سے قلم نکالنے لگا۔

کچھ دیر بعد ایک بوٹ جنرل راما اور اس کا سامان لے کر آمرستان کی طرف جا رہی تھی۔ تینوں سابقہ صدور جنرل ٹوٹو، جنرل شوشو اور جنرل مومو اپنی طرف آتی بوٹ کو دیکھ کر ہاتھ ہلا ہلا کر جنرل راما کو خوش آمدید کہہ رہے تھے۔ وہ خوش تھے کہ برج کی میز مکمل ہو گئی تھی۔ انہیں ان کا چوتھا کھلاڑی مل گیا تھا۔

آپ کہاں سے ہیں؟

سڈنی جیسے رنگ بہ رنگ شہر میں یہ جاننا بہت مشکل تھا کہ کون کہاں سے ہے۔ کم از کم میں تو ہمیشہ غلط اندازے لگاتا تھا۔ چہرے کے خدوخال سے اندازہ لگانا آسان بھی نہیں تھا۔ ضروری نہیں تھا کہ گوری رنگت اور سنہرے یا بھورے بالوں والا اصلی آسٹریلوی ہو۔ وہ مشرقی یورپ کا ہوسکتا تھا اور جنوبی افریقہ کا بھی۔ مخصوص ساخت کی ایشیائی ناک بھی کہیں کی ہوسکتی تھی، چین، کمبوڈیا، ملائیشیا، ویت نام یا تھائی لینڈ کی۔ پاکستانیوں کا معاملہ اور بھی مشکل تھا۔ رنگت صاف ہو تو عرب اور سانولی ہو تو انڈین۔ شاید یہی وجہ تھی کہ دو اجنبیوں کے درمیان گفتگو جلد ہی اس سوال پر پہنچ جاتی:

''آپ کہاں سے ہیں؟''

مجھے اس سوال سے چڑ ہوگئی تھی، میرا شاعر دوست نزار شہبانی اس سوال سے چڑنے میں مجھ سے کئی قدم آگے تھا۔ ہم دونوں ایک دوسرے کی ضد تھے۔ ندی کے دو کنارے، لیکن ''کہاں سے ہو'' کا سوال ہماری دوستی کے لیے پل بن گیا تھا۔

ہم دونوں کا اس سوال سے نمٹنے کا طریقہ بھی مختلف تھا۔ کوئی مجھ سے پوچھتا تو اندر ہی اندر جواب گونجتا ''جہنم سے!'' لیکن تہذیب کی منافقانہ رسم زبان تھام لیتی۔ دل کا کہا دل میں گھٹ کر رہ جاتا اور ہونٹوں سے ایک ایک کر کے جوابوں کے پھول جھڑنے لگتے۔ نزار شہبانی مجلسی آدمی نہیں تھا،

اسے رسمیں نباہنے سے بھی دلچسپی نہیں تھی۔ اسے بولنے کی ضرورت نہیں پڑتی، بس گول گول آنکھیں مزید سرخ ہوجاتیں اور سوال پوچھنے والا اِدھر اُدھر دیکھنے لگتا۔

نزار اور میرے ردِ عمل ظاہر کرنے کے طریقوں میں جو فرق تھا اس کی کئی وجوہات ہوسکتی تھیں۔ دونوں کا پس منظر مختلف تھا۔ پیشے بھی الگ تھے۔ حالانکہ مجھے نہیں معلوم تھا کہ وہ کیا کرتا ہے اور کچھ کرتا بھی ہے یا نہیں۔ ہمارے انداز اور طور طریقے بھی جدا جدا تھے۔ میں سماجی اخلاقیات کی تنگ سرنگ کا مسافر تھا اور نزار کے لیے مجلسی آداب بزدلی تھے یا منافقت۔ وہ جانتا تھا کہ اس کی طرح میں بھی ''کہاں سے ہو'' کے سوال سے چڑتا ہوں، پھر بھی اس موضوع پر اس نے مجھ سے کبھی گفتگو نہیں کی۔ اس کا ہر یقین اتنا مستحکم تھا کہ اسے کسی تائید کی ضرورت ہی نہیں تھی۔ میں نے دوستی پھر بھی قائم رکھی تھی، شاید اس لیے کہ نظریاتی طور پر میں بھی سسٹم کا باغی تھا لیکن دل میں جو آجائے وہ کہنے کی بدتمیزی اور گستاخی مجھ جیسے دنیادار آدمی میں نہیں تھی۔

نزار شہبانی مجھے میری کمزوری کا احساس دلانے میں کبھی ہچکچایا نہیں۔ ایک بار وہ اور میں ایک تقریب میں ساتھ گئے تھے، ہال میں داخل ہونے سے پہلے اس نے سر سے پیر تک میرا جائزہ لیا۔ شیو کیے ہوئے چمکیلے چہرے، مونچھوں کے رنگے ہوئے ایک ایک بال اور نفاست سے پہنے ہوئے سوٹ اور ٹائی کو غور سے دیکھا اور برا سا منہ بنا کر کہا ''تم بھی کسی سائنس دان کی بنائی ہوئی بھیڑ لگ رہے ہو، اندر جا کر تمھیں کیسے پہچانوں گا؟''

بھیڑوں کی مجلس میں واقعی سب ایک جیسے تھے۔ سوٹ ٹائی، بے داغ قمیصیں، نپی تلی گفتگو، ادائیں بھی سب ایک طرح کی تھیں۔ چمکیلے لباس، بالوں کے لہریے جیسے کسی شیمپو کا اشتہار، انگلیوں میں نگینوں کی چمک، بلاؤز کے کھلے گلے سے سینے کے بیچوں بیچ جاتی ہوئی گہری لکیر۔

نزار شہبانی سب سے الگ تھا۔ اس کی پتلون کی ٹوٹی ہوئی کریز اور قمیص کے کالر کی مڑی ہوئی نوکوں نے اس کی انفرادیت قائم رکھی تھی۔ اسی انفرادیت نے اسے مغرور بنا دیا تھا۔ وہ سب سے بے نیاز اپنے بے ترتیب بالوں اور بڑھی ہوائی داڑھی کو انگلیوں سے کھرچتا ہوا اپنے بغیر پالش کے گردآلود جوتوں پر نگاہ گاڑے کھڑا تھا۔ ایک مہمان کو اس میں سترھویں صدی کے یونانی دانش ور کی جھلکیاں نظر آئی تھیں۔ وہ نزار کی طرف بڑھا تھا لیکن اس سے پہلے کہ پوچھتا ''آپ کہاں سے ہیں؟'' نزار نے

سگریٹ سلگا لیا۔ وہ شخص ناک پر ہاتھ رکھ کر پیچھے ہو گیا۔ سیکورٹی گارڈ نے آ کر نزار کو تنبیہ کی کہ اندر سگریٹ پینا منع ہے۔ تب بھی اس نے سگریٹ نہیں بجھائی اور پورے ماحول پر سخت توہین آمیز نظر ڈالتا اور اسے سگریٹ کے دھویں سے پراگندہ کرتا ہوا عمارت سے باہر نکل آیا۔

اس وقت اندر آیا جب رسمی تقریروں کے بعد مشروبات پیش کیے جا رہے تھے۔ نزار کے لیے کسی بھی تقریب کا یہ سب سے اہم حصہ تھا۔ اس نے ایک بڑا سا گھونٹ لے کر اور مونچھوں سے بیئر کا جھاگ صاف کیے بغیر کہا ''گنگا الٹی بہہ رہی ہے۔ سگریٹ ممنوع اور شراب کی کھلی چھوٹ!''

ہماری دوستی کی شروعات بھی اسی سوال سے ہوئی تھی ''آپ کہاں سے ہیں؟'' ہم نے یہ سوال ایک دوسرے سے نہیں پوچھا تھا۔ ہم جس تقریب میں شریک تھے وہاں ہم دونوں اس سوال کے قہر کا نشانہ تھے۔ میں تو باری باری سب کو اپنی ہجرتوں کی کہانیاں سنا تا رہا لیکن نزار شہبانی نے سوال کرنے والوں اور اپنے درمیان سگریٹ کے گہرے دھویں کی دیوار قائم کر دی تھی۔ رائٹرز سنٹر کی محفل تھی اور عمارت کے باہر باغیچے میں بجی تھی اس لیے تمباکو نوشی کی کھلی چھوٹ تھی۔ صرف نزار ہی نہیں، سگار اور پائپ کا دھواں اڑا کر کچھ اور لوگ بھی اپنا شاعر و ادیب ہونا ثابت کر رہے تھے۔ نزار شہبانی کی باری آئی تو وہ اسٹیج پر جا کر شعر سنانے کے بجائے حاضرین کو ڈانٹنے لگا۔

''آپ مجھ سے کیوں پوچھتے ہو کہ میں کہاں سے ہوں۔ میں نے تو کبھی نہیں پوچھا آپ کہاں سے ہیں۔ کیا میں آپ کو کنگارو اور کوالا ریچھ سے مختلف طرح کا جانور نظر آتا ہوں؟''

سب نے پہلے مسکرا کر نظر انداز کرنے کی کوشش کی لیکن پھر نزار کے تیور دیکھ کر سہم گئے جو دھمکیاں دینے لگا تھا۔

''میرے پاسپورٹ کا رنگ بھی نیلا ہے۔ آپ میں سے بہت لوگوں کی طرح میں بھی بے روزگاری الاؤنس لیتا اور سرکار کے دیے ہوئے مفت فلیٹ میں رہتا ہوں۔ آئندہ مجھ سے نہ پوچھیں میں کہاں سے ہوں۔ جس نے پوچھا اس کے خلاف نسلی تعصب کا مقدمہ دائر کر دوں گا۔''

وہ شعر سنائے بغیر اتر آیا۔ سارا اسمتھ جسے نزار کی عربی شاعری کا انگریزی ترجمہ سنانا تھا وہ بھی مایوس سی نزار کے ساتھ ہی نیچے اتر آئی۔ لیکن جب سب نے زوردار تالیاں بجا کر اپنے غیر متعصب ہونے کا اعلان کیا تو سارا اسمتھ نے مسکراتے ہوئے ایک ایک کو دیکھ کر سر ہلایا اور داد وصول

کی۔ رائٹرز سنٹر میں نزار، سارا اسمتھ کے ذریعے متعارف ہوا تھا۔ وہ بھی نزار کے محلے میں ہاؤسنگ کمیشن کے دیئے ہوئے مفت فلیٹ میں رہتی تھی اور ان ادیبوں میں سے تھی جن کا شاہ کار ابھی تخلیق نہیں پا سکا تھا۔ اسے دیکھ کر پوچھنے کی ضرورت نہیں تھی کہ وہ کہاں سے ہے۔ صرف یہ پوچھا جا سکتا تھا کہ وہ کب جانے والی ہے۔ اس کے بدن پر تہہ در تہہ گوشت ہی گوشت تھا۔ میں نے اسے کبھی خالی ہاتھ نہیں دیکھا۔ ایک ہاتھ کی انگلیوں میں سگریٹ اور دوسرے ہاتھ میں شراب کا گلاس۔ میں نے اسے کبھی باتیں کرتے ہوئے بھی نہیں، صرف کھانستے ہوئے دیکھا تھا۔

نزار کی تقریر میرے دل کی آواز تھی۔ میں نے سب سے زیادہ زوردار تالیاں بجائی تھیں۔ تقریب ختم ہونے پر میں نزار کے پاس گیا جو الگ تھلگ کھڑا تھا۔ اپنا تعارف کرایا اور قریب کے ایک شراب خانے میں چلنے کی دعوت دی جو اس نے اس طرح قبول کی جیسے یہ اس کا حق تھا۔ سارا اسمتھ بھی ساتھ لٹک گئی تھی۔ نزار اس وقت اس کا ایک قیمتی اثاثہ تھا، وہ پوری قیمت وصول کرنا چاہتی تھی۔ شراب خانے میں دونوں مجھ پر دھوئیں کی گولہ باری کرتے رہے اور میں مسکراتا ہوا اپنے چہرے کے سامنے سے غبار جھلتا رہا۔ پیٹ میں بار بار مروڑ اٹھ رہا تھا کہ نزار سے پوچھوں "آپ کہاں سے ہیں؟" لیکن سوال کرنے کی ہمت نہیں تھی۔ نزار کچھ دیر کے لیے اِدھر اُدھر ہوا تو میں نے سارا سے پوچھا۔ اس کی کھانسی دوبارہ شروع ہوگئی۔ وہ اس وقت تک کھانستی رہی جب تک نزار واپس نہیں آ گیا۔ مجھے جواب مل گیا تھا۔ سارا کو بھی نہیں معلوم تھا۔

ایک دن میں نے ریڈیو پر عربی پروگرام کرنے والے اپنے ایک دوست سے پوچھا تھا کہ وہ میرے عرب شاعر دوست کو جانتا ہے۔ وہ جانتا تھا، اس نے انٹرویو کرنے کی کوشش بھی کی تھی۔

"وہ کہاں سے ہے؟" میں نے اس سے فوراً پوچھا تو وہ ہنسنے لگا۔

"وہ تمہارا دوست ہے، تم نے نہیں پوچھا؟"

"لیکن تم نے اسے انٹرویو کیا تھا۔"

"اس نے انٹرویو نہیں دیا۔ کہتا تھا یہ آسٹریلیا ہے، یہاں میں عربی زبان میں بات نہیں کرتا۔"

"تو پھر عربی زبان میں شاعری کیوں کرتا ہے؟"

"میں نے بھی یہی کہا تھا۔ کہتا ہے یہ اس کی مجبوری ہے۔ شاعری کے لیے زبان پر حاوی ہونا

ضروری ہے۔ بول چال کے لیے زبان کا مادری ہونا ضروری نہیں۔''

میں نے ایک دن ڈرتے ڈرتے نزار سے پوچھ ہی لیا۔ یہ نہیں کہ وہ کہاں سے ہے بلکہ یہ کہ اسے اس سوال سے اتنی نفرت کیوں ہے۔

''میں دوغلا نہیں ہوں۔'' خلافِ معمول اس نے بہت نرمی سے جواب دیا۔ ''میں ایک ساتھ دو کشتیوں کی سواری نہیں کرسکتا۔ میں اپنی پرانی نسلی شناخت پیچھے چھوڑ آیا ہوں۔''

اس نے جواب میں مجھ سے نہیں پوچھا کہ ''کہاں سے ہو'' کے سوال سے میں کیوں چڑتا ہوں۔ وہ پوچھتا بھی تو شاید میں بغلیں جھانکنے لگتا۔ میرے لیے یہ کوئی اصولی معاملہ نہیں تھا۔ بس پوچھے جانے کی تکرار نے بیزار کر دیا تھا۔ جواب میں بار بار جو ٹیپ بجانا پڑتا اس سے بھی وحشت ہوتی تھی۔

نیا نیا آسٹریلیا آیا تھا تو گفتگو کا سرا پکڑنے کے لیے میں بھی اسی سوال کا سہارا لیتا تھا۔ لیکن پچھلے چند سالوں میں بہت کچھ بدل گیا تھا۔ کہاں سے ہو کے جواب میں پاکستان کا نام سنتے ہی گفتگو عالمی دہشت گردی اور خودکش بمباروں کی طرف مڑ جاتی۔ مجھے ان معاملات پر بولنا پسند نہیں تھا۔ ٹیکسی ڈرائیوراس سوال سے بیزاری کی ایک اور وجہ تھی۔ وہ کرایہ لینے کے ساتھ مسافروں سے ذاتی سوال کرنا اپنا حق سمجھتے تھے۔

ٹیکسی ڈرائیوروں کی نسلی ترتیب ہر بڑے شہر کی طرح سڈنی میں بھی تقریباً ایک جیسی تھی۔ ہر پانچ میں سے ایک یا دو ہندوستانی یا پاکستانی، ایک عرب، ایک چینی اور ایک آدھ مشرقی یورپ یا کسی ایسی ہی نسل کا۔ نسلی ترتیب جو بھی ہو گفتگو میں الجھانے کی صلاحیت سب میں یکساں تھی۔ فرق صرف موضوعات کا تھا۔ پاکستانی ڈرائیور مجھے دیکھتے ہی پہچان سکتا تھا کہ میں اس کا ہم وطن ہوں، پھر بھی گفتگو کی ابتدا اسی چڑانے والے سوال سے کرتا۔

''آپ کہاں سے ہیں؟''

''پاکستان سے!'' میرا یہ جواب سنتے ہی وہ جذباتی ہو جاتا۔

''میں بھی! کہاں سے؟''

''کراچی سے!''

''میں بھی! کہاں سے؟''

''نارتھ ناظم آباد سے!''

''میں بھی!'' اس کی آواز جوشِ جذبات میں اور اونچی ہو جاتی، چہرہ سرخ ہونے لگتا اور مجھے لگتا گاڑی ٹکرانے ہی والی ہے۔ وہ مجھ سے بلاک اور گلی کا نمبر پوچھتا اور ہم بلاک اے، بی یا سی کی گلی نمبر 22،21 یا 23 کے نکڑ پر کھڑے کسی مشترکہ شناسا کی خیریت پوچھ رہے ہوتے۔

عرب ٹیکسی ڈرائیور کو پتا چلتا کہ میں مسلمان ہوں تو وہ عالمِ اسلام کے خلاف امریکہ اور اسرائیل کی سازشوں کی تفصیلات بتانے لگتا۔ چینی ڈرائیوروں کو سیاست سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ وہ صرف یہ پوچھتے کہ میں بزنس کیا کرتا ہوں۔ انہیں یقین دلانا مشکل ہو جاتا کہ ان کا یہ مسافر جو بزنس سوٹ پہنے ہے، جس کے ہاتھ میں بریف کیس ہے، بال قاعدے سے سنورے ہوئے ہیں اور ناخن بھی کسی پیشہ ور نے تراشے اور خراشے ہیں، وہ بزنس مین نہیں ہے۔ چینیوں کے لیے لوگوں کی صرف دو قسمیں تھیں۔ ایک وہ جو بزنس کرتے ہیں اور دوسرے وہ جو بزنس نہیں کرتے، اور جو بزنس نہیں کرتے وہ ٹیکسی میں نہیں بیٹھتے۔ ان کے لیے سرکار نے ٹرینیں اور بسیں چلائی ہیں یا وہ بینکوں سے قرضہ لے کر اپنی گاڑی خود چلانے کی مشقت کرتے ہیں۔

نزار شہبانی بھی ٹرین اور بس کا مسافر تھا۔ میری وجہ سے کبھی کبھی ٹیکسیوں میں دھکے کھاتا تھا، لیکن اس نے ڈرائیوروں کو کبھی کبھی یہ سوال مکمل نہیں کرنے دیا کہ ''آپ کہاں سے ہیں۔'' بیچ میں روک کر بتا دیتا کہ اسے سفر کے دوران گفتگو پسند نہیں ہے۔ میں تقریبات میں تو نزار کی نقل نہیں کر سکتا تھا لیکن اب ٹیکسی کی حد تک نزار کا نسخہ استعمال کرنے لگا تھا۔ پچھلی نشست کا دروازہ کھول کر بیٹھتا اور بریف کیس سے کوئی فائل نکال کر اس پر نظریں جما دیتا۔ ٹیکسی ڈرائیور کو ریڈیائی پیغام میں ملنے والے پتے پر کوئی شبہ ہوتا تو میں نظر اٹھا کر بتا دیتا اور پھر فائل پر جھک جاتا۔

نسخہ کارگر تھا۔ ٹیکسی ڈرائیور بھی برا سا منہ بنا کر ساری توجہ صرف ڈرائیونگ پر مرکوز کر دیتے۔ انہیں نک چڑھے مسافروں سے کوئی دلچسپی نہیں تھی، نہ انہیں مرعوب ہونے کی ضرورت تھی۔ وہ سب بادشاہ لوگ تھے اور کسی بے حال ملک کے نہیں آسٹریلیا کے ٹیکسی ڈرائیور تھے جن کی کمائی اچھے اچھوں سے اچھی تھی۔

لیکن ایک دن سب کچھ درہم برہم ہو گیا۔ پاکستان کے سیاسی نظام کی طرح۔ اس روز نزار اور

میں کہیں ساتھ جا رہے تھے اور پچھلی نشست کے اپنے اپنے دروازے سے ٹیکسی میں داخل ہوئے تھے۔ نزار نے پچھلی سیٹ سے سر ٹکا کر آنکھیں بند کر لی تھیں اور میں اس رسالے میں کھو گیا تھا جو نزار نے مجھے پڑھنے کے لیے دیا تھا۔ ایک بار یہ جاننے کے لیے کہ ٹیکسی کیوں رکی ہوئی ہے، نظر اٹھا کر دیکھا تو پلک جھپکنا بھول گیا۔ ٹیکسی چلانے والا کوئی پاکستانی، عرب یا چینی نہیں، بے حد گھنے اور گھنگریالے بالوں والی ایک عورت تھی۔ اس نے بھی پلٹ کر دیکھا اور ہلکے سے مسکرا دی۔ ہونٹ اور آنکھیں ہی نہیں پورا چہرہ مسکرایا تھا اور اس کے ساتھ ہی اردگرد کی ساری دنیا بھی۔ میری باچھیں بھی کھل گئی تھیں اور پیٹ میں اس سوال کا مروڑا اٹھنے لگا تھا "آپ کہاں سے ہیں؟"

میں پہلے بھی ٹیکسی ڈرائیور عورتیں دیکھ چکا تھا لیکن یہ ٹیکسی ڈرائیور نہیں تھی، یہ تو صرف عورت تھی۔ لیکن تھی کہاں سے؟ سڈنی میں فیجی کی کچھ عورتیں ٹیکسی چلاتی تھیں لیکن یہ ان میں سے نہیں ہو سکتی تھی۔ فیجی کی عورتیں یا تو فربہ ہوتی ہیں یا ڈھانچہ۔ ان کا رنگ بھی گہرا ہوتا ہے۔ اس کا رنگ تو شہد ملے ہوئے دودھ جیسا تھا۔ ہندوستانی بھی نہیں ہو سکتی تھی۔ انھیں نخرے کرنے کی عادت ہوتی ہے، ٹیکسی چلانا ان کے بس کی بات نہیں تھی۔ پاکستان کی کوئی عورت شاید ہمت کر سکتی تھی لیکن اس عورت کا چہرہ کرخت ہوتا جس پر زمانے کے ظلم وستم کی داستان لکھی ہوتی۔

وہ عرب ہو سکتی تھی یا اسپینی، لیکن اسپینی عورتیں اتنا گہرا میک اپ نہیں کرتیں نہ اپنی ابروئیں اتنی نوک دار اور نپی تلی رکھتی ہیں۔ وہ یقیناً عرب تھی، شاید لبنانی جو سڈنی میں بڑی تعداد میں بسے ہوئے تھے۔ لیکن وہ خوش شکل جوان عمر عورت اگر عرب تھی تو ٹیکسی چلانے کی مشقت کیوں کر رہی تھی؟ اس کے تو ابھی ادائیں دکھانے اور نخرے اٹھوانے کے دن تھے۔ میں سر جھٹک کر جیب میں اپنا بزنس کارڈ تلاش کرنے لگا۔ کرایہ دیتے ہوئے پوچھوں گا کہ وہ کہاں سے ہے ساتھ ہی اسے اپنا کارڈ بھی دوں گا۔ مجھے یقین ہے وہ فون کرے گی۔ میں اسے ٹی وی اسٹیشن دکھانے بلاؤں گا۔ ہو سکتا ہے ڈنر پر بھی لے جاؤں۔ اس کے بعد کا منظر نامہ سوچنا ابھی قبل از وقت تھا۔

کھڑکی سے باہر دیکھا تو ابھی آدھا راستہ باقی تھا۔ وقت کافی تھا۔ ٹریفک بھی زیادہ نہیں تھا۔ اسے گاڑی چلانے کے دوران بھی گفتگو کی ڈور میں باندھا جا سکتا تھا۔ میں نے زبان کی ورزش کی۔ گلے کے عضلات سہلائے، کھنکار کر حلق صاف کیا اور اپنی نشریاتی آواز تیار کر کے پوچھنے ہی والا تھا کہ

دیکھا نزار شہبانی، جس نے نہ جانے کب اپنی آنکھیں کھول لی تھیں، ڈرائیور کی اگلی نشست پر جھکا ہوا پوچھ رہا تھا۔

''آپ کہاں سے ہیں؟''

''عراق سے!'' اس نے اپنی گھنٹیاں بجاتی ہوئی آواز میں مسکرا کر کہا۔

''میں بھی!'' نزار شہبانی تقریباً چیخ کر بولا اور اس کے بعد گاڑی میں اونچے پُر جوش سُروں میں عربی زبان گونجنے لگی۔

پہلی لکیر

دسمبر ۲۰۵۰ء کی آج کی رات اتنی ہی سرد اور برفانی تھی جتنی آج سے پچاس سال پہلے پہلے دسمبر ۲۰۰۰ء کی وہ رات جب حاجی گونگے شاہ نے کشمیر کی کنٹرول لائن کے عین درمیان احتجاج کا نیا بیج بویا تھا۔ پچاس سال گزرنے کے بعد بھی کچھ زیادہ نہیں بدلا تھا۔ آبادیوں کو تقسیم کرنے والا خط اب بھی موجود تھا بلکہ اور گہرا ہو گیا تھا جسے عبور کرنے پر اب بھی پابندی تھی۔ ہوا میں بارود کی بو بھی اسی طرح تھی، نفرتیں اور دشمنیاں بھی وہی تھیں، پہرے بھی قائم تھے، راتیں بھی اتنی ہی سرد تھیں، بس فرق یہ تھا کہ کنٹرول لائن پر اُس رات جیسی تاریکی نہیں تھی جب حاجی گونگے شاہ نے احتجاج کی ایک نئی روایت شروع کی تھی اور جہاں اب سفید چکنے ٹائلوں سے بنی ہوئی مسطح دیوار کھڑی تھی جو تیز روشنیوں میں تاج محل کی طرح چمکتی تھی۔

حاجی گونگے شاہ کے مزار اور اس کی یادگار کی زیارت کرنے اور اس کی روایت کا اعادہ کرنے والے زائرین کا سال بھر تانتا بندھا رہتا تھا۔ دونوں طرف کی حکومتوں نے اپنی اپنی طرف چھوٹی چھوٹی دکانیں کھولنے اور اسٹال لگانے کی اجازت دے دی تھی جہاں مصوروں کے بنائے ہوئے حاجی گونگے شاہ کے احتجاجی پوز کی تصویریں، بلّے، ریفریجریٹر پر چپکنے والے مقناطیس اور حاجی گونگے شاہ کی زندگی پر مختلف زبانوں میں چھپی ہوئی کتابیں بیچی جاتی تھیں۔ ۲ دسمبر کی رات آتی تو رونق دوبالا ہو جاتی۔ یہ وہ

تاریخ تھی جب حاجی گونگے شاہ نے کنٹرول لائن پر انوکھا احتجاج کر کے دنیا بھر کی توجہ اپنی طرح کھینچی تھی۔ پچاس سال گزرنے کے بعد بھی یہ توجہ اس طرح قائم تھی۔ آج بھی سرحد کے دونوں طرف رہنے والے اور دنیا بھر کے انسانی حقوق کے پرچارک اقوامِ متحدہ کے خصوصی اجازت نامے حاصل کر کے حاجی گونگے کو تعظیم دینے اور اس کے احتجاج کی روایت تازہ کرنے یہاں آتے تھے۔

حاجی گونگے شاہ کی روایت تھی کیا! یہ کہانی بہت سے لوگوں نے لکھی تھی لیکن جو کہانی سب سے زیادہ مشہور ہوئی وہ ایک غیر معروف کشمیری ادیب کی تھی جس نے صرف قلم اور بیان کا زور صرف نہیں کیا تھا بلکہ پوری تحقیق کے بعد حاجی گونگے شاہ کی شخصیت کے ایک ایک پہلو کا ہر زاویے سے جائزہ لیا تھا۔ اس کی یہ کہانی دنیا بھر کی کئی زبانوں میں چھپی تھی جس کے بعد وہ کشمیر کا ایک بے نام خستہ حال ادیب نہیں رہا تھا، اسے اپنے لکھے ہوئے ایک ایک لفظ کی رائلٹی ملتی تھی جو اس کے مرنے کے بعد اب تک اس کے خاندان کا پیٹ پال رہی تھی۔ اس نے یہ کہانی لکھی بھی کچھ اس طرح تھی جیسے سب کچھ اس کے سامنے ہوا ہو اور اس نے حاجی گونگے شاہ کے دماغ کی ہر گونج اور دمک کو خود سنا اور پڑھا ہو۔ پیلی لکیر کے عنوان سے لکھی گئی یہ کہانی کچھ اس طرح شروع ہوئی تھی:

''حاجی گونگے شاہ نے اپنی لکڑی کی بنی ہوئی کوٹھری کا دروازہ کھول کر باہر جھانکا تو ہوا کے برفیلے جھونکوں نے اس کا چہرہ سُن کر دیا۔ اس کی پوری زندگی برفانی طوفانوں کے تھپیڑے کھاتے ہوئے گزری تھی پھر بھی اسے پھریری آ گئی۔ لیکن وہ واپس نہیں گیا، اس طرح کھڑا رہا۔ برف کے ذرّے چہرے سے ٹکرا رہے تھے جس سے اس کی داڑھی اور مونچھیں کچھ اور سفید ہو گئی تھیں۔ کوٹھری کے کھلے دروازے سے لالٹین کی پیلی روشنی باہر رینگ کر کچھ دور ہی جا سکی تھی جس کے بعد مکمل اندھیرا تھا۔ چاند کی پہلی یا دوسری تاریخ تھی، حاجی گونگے شاہ کو اپنے مشن کی تکمیل کے لیے ایسی ہی اندھیری رات کی ضرورت تھی، جب کوئی اسے دیکھ نہ سکے۔ خود اسے دیکھنے کے لیے روشنی کی ضرورت نہیں تھی۔ اس کی تمام عمر کپوارہ کے آس پاس کی پہاڑیوں میں چڑھتے اترتے اور جنگلوں کی بھول بھلیوں میں بھٹکتے ہوئے گزری تھی۔ وہ آنکھ بند کر کے کہیں بھی جا سکتا تھا۔ لیکن ہواؤں کے طوفانی راستے اڑا لے جاتے ہیں، سب نشانیاں ختم کر دیتے ہیں۔ اسی لیے اس نے لالٹین روشن اور کوٹھری کا دروازہ کھلا رکھا

تھا۔ روشنی کی یہ چھوٹی سی دراڑ واپسی کے سفر میں منزل کا نشان بن کر اسے گھر پہنچنے کی راہ دکھا سکتی تھی۔

کوٹھری میں لکڑیوں کا وہ ذخیرہ ابھی باقی تھا جو وہ اپنی کوٹھری کے آس پاس پھیلے ہوئے جنگل سے چُن کر لایا تھا۔ لیکن اس نے آج کوٹھری کے بیچوں بیچ بنی ہوئی پتھروں کی بھٹی میں لکڑیاں نہیں جلائی تھیں۔ اسے برفانی رات میں سفر کرنا تھا اور کوٹھری کی آرام دہ حرارت اسے کمزور کر سکتی تھی۔ باہر نکلنا مشکل ہو سکتا تھا۔ حاجی گونگے شاہ کو اپنے ایمان کی طاقت پر بہت بھروسہ تھا جس نے اسے اب تک زندہ رکھا تھا، لیکن آج کی رات اسے صرف ایمان کی نہیں، جسمانی قوّت کی بھی ضرورت تھی۔ ایک وقت تھا جب اس کی جسمانی قوت سانڈ سے کم نہیں تھی۔ اس کی کلہاڑی کے زور سے جنگل کے درخت کانپتے تھے۔ گونگا ہونے کے بعد یہ قوّت اور بڑھ گئی تھی، ساتھ ہی حِسّیات بھی تیز ہو گئی تھیں۔ حِسّیات کی تیزی اب بھی قائم تھی لیکن ضعیفی نے قویٰ مضمحل کر دیے تھے۔ اسے یقین تھا کہ وہ جوانی کے دن یاد کر کے کم از کم ایک رات کے لیے اپنی پرانی قوّت بحال کر لے گا۔ یادیں پرانے زمانے واپس لے آتی ہیں۔ جب چاہا کوئی غم، کوئی خوشی تازہ کر لی۔ اس کی ماں کو مرے کتنے برس بیت گئے تھے، لیکن اس کی موت کا دن یاد کر کے وہ آج بھی رو سکتا تھا۔ محمودہ کی شادی یاد آتے ہی اس کے کانوں میں شہنائیاں گونجنے لگتی تھیں۔ وہ اگر پوری یکسوئی سے ہر وہ لفظ یاد کرتا جو اس نے گونگا ہونے سے پہلے سنا اور بولا تھا تو زبان گنگنانے اور کانوں کے پردے خود بخود سن سن کرنے لگتے۔ لیکن اس زمانے میں اسے یادوں کے اس کمال کا اندازہ نہیں تھا اور اب اسے آوازوں کے جنگل سے باہر رہنے کی عادت ہو گئی تھی۔ کچھ بولے اور سنے بغیر زندگی کتنی مطمئن تھی، بس اگر اس میں بار بار یہ حادثے نہ آئے۔

اس کا گونگا اور بہرا ہونا بھی ایک حادثے کا ہی نتیجہ تھا۔ وہ اس وقت بارہ برس کا تھا یا شاید تیرہ کا، اسے اپنی صحیح عمر یاد نہیں تھی۔ اس روز پوری وادی میں ہڑتال تھی، سب دکانیں، بازار، اسکول اور دفاتر بند تھے۔ گاؤں میں کسی نے بتایا تھا کہ سرینگر میں جلسہ ہوگا اور جلوس نکلے گا۔ وہ بھی سرینگر جانے کے شوق میں گاؤں کے لڑکوں کی ٹولی میں شامل ہو کر چل پڑا۔ نوے کلومیٹر کا سفر تھا، وہ فجر کی نماز پڑھ کر نکلے تھے اور جمعہ کی نماز تک سرینگر پہنچ گئے تھے۔ وہ پہاڑ سے پتھر اور جنگلوں سے لکڑیاں توڑ کر اپنا اور اپنے کنبے کا پیٹ پالتے تھے۔ ان کے لیے پیدل سفر کوئی مشقت نہیں تھا، اور وہ مزدوری کرنے نہیں ہڑتال میلہ دیکھنے جا رہے تھے۔ انھوں نے پورا سفر ہنستے کھیلتے اور نعرے لگاتے ہوئے طے کیا تھا، کبھی

کبھی کسی لاری یا ٹرک کا مہربان ڈرائیور انھیں بٹھالیتا تو ان کا جوش وخروش اور بڑھ جاتا۔

جمعے کی نماز کے بعد جب جلوس نکلا تو ان کی خوشی کا کوئی ٹھکانا نہیں تھا۔ انھوں نے ایسا میلہ کبھی نہیں دیکھا تھا۔ نعروں کے ساتھ ان کا جوش وخروش لحہ بہ لحہ بڑھ رہا تھا۔ انھوں نے ایسا کھیل کبھی نہیں کھیلا تھا۔ لیکن پھر اچانک کیا ہوا کہ ڈنڈے برسنے لگے اور ہوا میں آنسو گیس گھل گئی۔ ہر شخص آنکھوں پر گیلا کپڑا رکھے کسی نہ کسی طرف بھاگ رہا تھا۔ وہ اپنی ٹولی سے بچھڑ گیا تھا اور بچ نکلنے کا رستہ ڈھونڈ رہا تھا کہ اس کی گردن اور سر پر لاٹھی کے بھرپور وار پڑے اور اس کے بعد اسے کچھ پتا نہیں کہ کیا ہوا۔

کئی لوگ مرے اور بہت سے زخمی ہوئے تھے۔ وہ خوش قسمت تھا کہ ڈاکٹروں نے اس کے دماغ کی سرجری کر کے اسے مرنے سے بچالیا تھا۔ لیکن دماغ پر کسی جگہ ایسی جگہ چوٹ پڑی تھی کہ بولنے اور سننے کی طاقت چلی گئی تھی۔ ڈاکٹروں نے کہا تھا کہ ایک اور آپریشن کر کے اسے ٹھیک کیا جا سکتا ہے۔ لیکن یہ بھی خطرہ تھا کہ دماغ مفلوج ہو جائے یا وہ آنکھیں بھی کھودے۔ مفت آپریشن کی پیش کش تھی لیکن اس نے منع کر دیا۔ وہ گونگا اور بہرا ہو کر جی سکتا تھا، پاگل اور نابینا ہو کر نہیں۔ اس کی ماں نے شکرانے کے نفل پڑھے تھے۔ وہ خوش تھی کہ اس کے بیٹے کی صرف دیکھنے اور سننے کی طاقت گئی تھی، ہاتھ یا پاؤں گیا ہوتا تو اپاہج ہو کر ناکارہ ہو جاتا۔ خود اسے لگا تھا کہ اس کا نیا جنم ہوا ہے۔ اس روز غلام رسول مر گیا تھا اور گونگے شاہ پیدا ہوا تھا۔

وہ اس وقت دروغ ملا کے پاس چہل پٹی میں اپنی ماں، بہن اور بھانجی کے ساتھ رہتا تھا۔ باپ کو کشمیر کی کنٹرول لائن پہلے ہی چاٹ چکی تھی۔ گونگے شاہ کا آدھا خاندان کنٹرول لائن کے دوسری طرف رہتا تھا۔ ایک رات اس کے تایا نے اپنے بھائی سے ملنے کی تڑپ میں لکیر پار کرنے کی کوشش کی تھی لیکن سرحدی محافظوں کی گولیوں کا نشانہ بن گیا تھا۔ گونگے شاہ کا باپ ٹوٹ کر رہ گیا تھا۔ اب اسے سرحد پار کر کے اپنے بھائی کے خاندان کا غم بانٹنا اور گلے لگ کر رونا تھا۔ اسے یقین تھا کہ وہ سرحدی محافظوں کی آنکھوں میں دھول جھونک سکتا ہے۔ اس کوشش میں اسے بھی گولیاں چھلنی کر گئیں۔ اسے یہ بھی پتا نہ چل سکا کہ اسے کس کی گولیاں لگی تھیں، اس طرف والوں کی یا اُس طرف والوں کی۔ اس کی لاش تک نہیں آئی۔ وہیں کہیں دفنا دیا گیا۔

شوہر کی موت کے بعد گونگے شاہ کی ماں میں پہلے جیسا دم خم نہیں رہا تھا۔ وہ مرنے سے پہلے

گونگے شاہ کی شادی کردینا چاہتی تھی۔لیکن گونگے شاہ نے اپنے ہر جذبے کو تالا لگادیا تھا۔ایک دن اس کی بہن ایک رشتہ طے کر آئی تو وہ گھر چھوڑ کر شمس باڑی چلا گیا جہاں اندھی اور بہری پریاں رہتی تھیں اور جو برف باری کے موسم میں شکار کرنے باہر نکلتی تھیں۔وہ برف پڑنے سے پہلے ہی یہ سوچ کر واپس آگیا کہ گونگی بہری پریوں نے اسے شکار کرلیا تو اس کی تیزی سے بڑی ہوتی ہوئی بھانجی کا کیا ہوگا۔

اس کی واپسی کے بعد اس کی ماں اور بہن نے اس کی شادی کے بارے میں سوچنا چھوڑ دیا۔ایک دن اس کی ماں بہولائے بغیر خاموشی سے مرگئی۔اب صرف بہن اور بھانجی رہ گئی تھیں۔بہن آدھی بیوہ تھی۔اس کا شوہر اپنی بیوی اور بیٹی کو چھوڑ کر مزدوری کرنے سرینگر چلا گیا تھا جہاں وہ لاپتہ ہو گیا۔کسی نے بتایا تھا کہ پولیس اسے دہشت پسندی کے شبہے میں پکڑ کرلے گئی تھی،تشدد سے ہلاک ہوگیا تو اس کی لاش غائب کردی گئی۔کسی اور نے بتایا تھا کہ وہ مزدور بھرتی ہوکر کسی خلیجی ملک چلا گیا تھا۔گونگے شاہ کی بہن کو دوسری کہانی پر یقین تھا،لیکن وہ زیادہ دیر انتظار نہ کرسکی اور کبھی واپس نہ آنے کے لیے ماں باپ کے پاس عدم آباد چلی گئی۔

گونگے شاہ کے پاس اب صرف اس کی بھانجی محمودہ رہ گئی تھی جو اس کی کل کائنات تھی اور جسے وہ دیوانہ وار چاہتا تھا۔اس کا یہ خوف اور بڑھ گیا تھا کہ وہ نہیں رہا تو محمودہ کا کیا ہوگا۔موت اس کی وادی میں بہت آزادی سے گھومتی تھی۔وہ کسی پہاڑی سے گر سکتا تھا،کوئی پتھر اس کا سر پھاڑ سکتا تھا،جنگل میں کسی درندے کا نشانہ بن سکتا تھا،کسی پہرے دار کی اندھی گولی اس کا سینہ چیر سکتی تھی۔زندگی میں پہلی بار اسے اپنی موت سے اتنا خوف محسوس ہوا۔اس نے محمودہ کی شادی کر کے اس خوف سے نجات حاصل کرلی۔

اب گونگے شاہ مکمل طور پر آزاد تھا۔وہ اب مزاروں اور خانقاہوں میں خدمت گزار بن کر رہ سکتا تھا۔اس نے سوچا تھا کہ وہ پونچھ والے فقیر کی طرح شمس باڑی کے پہاڑوں میں بارہ سالہ چلّہ کھینچے گا،لیکن اس نے اپنے ارادے پر عمل نہیں کیا۔اسے معلوم تھا کہ شمس باڑی کی گپھاؤں میں رہنے والی اندھی اور بہری پریاں اس کی توجہ بھٹکاتی رہیں گی۔ان پریوں کا خیال آتے ہی اس کے دل میں عجب میٹھا میٹھا سا درد ہونے لگتا تھا۔اس نے کئی بار سوچا تھا کہ برف باری کے موسم میں جب پریاں پہاڑوں پر اترتی ہیں،وہ شمس باڑی جائے،کسی ایک پری کا ہاتھ پکڑ رو ہیں بیٹھ جائے اور ساری زندگی گزار دے۔اسے یقین تھا کہ کسی پری کے ہاتھوں مرنا بھی بہت پُر لطف ہوگا۔

لیکن وہ کبھی شمس باڑی نہیں گیا۔ وہ پریوں کا خیال چھوڑ کر پاڑی پورہ کے گاؤں ٹنڈی مومن میں حاجی بہادر کے مزار پر جا بیٹھا۔ وہیں اس پر حج کرنے کا جنون سوار ہوا۔ حاجی بہادر نے سات حج کیے تھے اور وہ بھی پیدل۔ گونگے شاہ کو یقین تھا کہ وہ بھی پیدل حج کر سکتا ہے۔ حج اس پر واجب بھی ہو گیا تھا۔ اس پر کوئی ذمّے داری نہیں تھی، کوئی قرضہ نہیں تھا، اور مکّہ تک پیدل سفر کے لیے ٹانگوں میں طاقت بھی تھی۔ اس نے کسی سے رستوں کا نقشہ بنوایا اور کمر پر جھولا ڈال کر چل پڑا۔

گونگے شاہ نے پیدل سفر کر کے مکّہ تک پہنچنے کی سات کوششیں کیں لیکن ہر بار بھٹک کر واپس آجاتا۔ ساتویں کوشش کے بعد محمودہ سے ملنے چھل پٹی گیا تو مسجد کے امام نے اسے یقین دلایا کہ وہ حج کی نیت سے سات سفر کر چکا ہے، اللہ تعالیٰ نے اس کا حج قبول کر لیا ہوگا۔ اس رات عشاء کی نماز کے بعد سب نمازیوں نے اسے حج کی مبارک باد بھی دے دی۔ گونگے شاہ اس دن کے بعد حاجی گونگے شاہ ہو گیا۔

اس نے چھل پٹی کا آبائی مکان محمودہ کے نام کر دیا تھا اور نزدیک ہی جنگل کی اترائی میں لکڑی کی کوٹھری بنا کر رہنے لگا تھا۔ یہاں اسے چلّہ کھینچنے، وظیفے پڑھنے اور اللہ سے لَو لگانے کے لیے مکمّل تنہائی اور سکون حاصل تھا۔ اس کی ضرورتیں زیادہ نہیں تھیں، بلکہ تھیں ہی نہیں۔ اسے صرف دو وقت کی روٹی اور لالٹین بھر مٹی کا تیل چاہیے تھا۔ اتنا بڑا جنگل اس کی ضرورتیں پوری کرنے کے لیے کافی تھا۔ لین دین کے سودے پر آٹا اور مٹی کا تیل بھی مل جاتا تھا۔ مہینے دو مہینے میں محمودہ اور اس کا شوہر اس کے ساتھ پورا دن گزار جاتے۔ اس دن حاجی گونگے شاہ کا دل خوشیوں سے بھر جاتا۔ اس کی زندگی کا رشتہ محمودہ کی زنجیر سے جڑا تھا ورنہ وہ خود تو محض سانسیں لیتا ہوا ایک مردہ وجود تھا۔ لیکن ایک دن یہ زنجیر اور یہ رشتہ بھی ٹوٹ گیا۔ محمودہ اور اس کا شوہر ایک رات قریبی جنگل میں لکڑیاں چننے گئے تھے اور بھٹک کر کنٹرول لائن کے پاس پہنچ گئے تھے۔ سرحدی محافظوں نے انھیں سرحد پار سے آنے والے دہشت گرد سمجھ کر گولیوں سے بھون دیا۔ حاجی گونگے شاہ تقریباً ایک سال بعد اپنی کوٹھری سے باہر نکل کر اترا تھا اور اپنے چھل پٹی کے گھر آیا تھا جہاں محمودہ اور اس کے شوہر کی گولیوں سے چھلنی لاشیں کفن میں لپٹی رکھی تھیں۔ پورا گاؤں سراپا احتجاج بن کر جمع تھا۔ ہر طرف غصّے کی آگ پھیلی تھی۔ جنازے کا جلوس گلی گلی گھما کر قبرستان لے جایا گیا تھا۔ نعروں کے شور سے پوری وادی گونج رہی تھی جس کی دھمک سری نگر تک بھی پہنچی تھی۔ سرکاری

اہلکاروں نے اپنی غلطی کا اعتراف کیا تھا۔ وہ نادم تھے۔ سرحدی پولیس کا کمانڈر تبدیل کر دیا گیا تھا۔ حاجی گونگے شاہ کو معاوضہ دینے کا اعلان بھی ہوا تھا، لیکن اسے کچھ نہیں چاہیے تھا۔

چند دنوں بعد جب احتجاج دم توڑ گیا اور شور تھم گیا تو حاجی گونگے شاہ واپس اپنی کوٹھری میں آ گیا۔ اس کے اندر کا دکھ اور غصہ دھیما نہیں ہوا تھا بلکہ زہر بھری چنگاریوں کی طرح اس کی رگوں میں ناچ رہا تھا۔ اس کی یہ کیفیت پہلے کبھی نہیں ہوئی تھی۔ دکھوں کی فصل کئی بار تیار ہوئی اور کٹی تھی لیکن اسے غصہ کبھی نہیں آیا تھا۔ اس کا تایا سرحد پار کرتے ہوئے مارا گیا تھا، یہ اس کی اپنی غلطی تھی۔ اس کے باپ نے بھی یہی غلطی کی تھی اور گولی کھائی تھی۔ اس کا بہنوئی بھی پیسوں کے لالچ میں گاؤں چھوڑ کر گیا تھا، اس کے ساتھ جو کچھ بھی ہوا ہو گا وہ اس کا مقدر تھا، لیکن معصوم محمودہ تو بس لکڑیاں چن رہی تھی۔ اس نے تو سرحد چھوئی بھی نہیں تھی، آخر وہ کیوں؟

حاجی گونگے شاہ کو ان فوجیوں پر غصہ نہیں تھا جن کی گولیوں سے اس کے خاندان کے کتنے لوگ اور اب محمودہ بھی مر گئی تھی۔ اس کا غصہ اس کنٹرول لائن کے خلاف تھا جس کی خون کی پیاس بجھ نہیں سکی تھی۔ گولیاں چلانے والے تو محض کل پرزے تھے، جڑ وہ سرحدی لکیر تھی جو لاشیں اگا رہی تھی۔ اسے اس لکیر کو پیٹنا اور اس پر اپنی نفرت کا زہر تھوکنا تھا، کسی کے لیے نہیں، صرف اپنے اندر کی آگ بجھانے کے لیے ورنہ وہ چین سے مر نہیں سکے گا۔

دسمبر ۲۰۰۰ء کی اس رات جب ہر طرف تاریکی تھی اور سناٹا تھا، یخ بستہ ہواؤں کے تھپیڑوں سے رگوں میں خون جم رہا تھا، حاجی گونگے شاہ اپنا احتجاج رقم کرنے اور اپنے قلب کو تسلیم دینے اپنی کوٹھری سے نکلا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ اسے کیا کرنا ہے۔ اس وقت برف باری میں کچھ اور شدّت آ گئی تھی، زمین اور درختوں پر برف کی سفید تہہ اور دبیز ہو گئی تھی۔ لیکن ہوا اور برف کا طوفان اسے کنٹرول لائن تک پہنچنے سے روک نہیں سکا۔ وہ سرحد کی اس لکیر کو اس طرح پہچانتا تھا جیسے آنکھوں میں کھنچی ہوئی سرمے کی لکیر۔ اسے یہ بھی یقین تھا کہ وہ کنٹرول لائن پر پہنچنے اور اس سے اپنا انتقام لینے سے پہلے مارا نہیں جائے گا۔ دونوں طرف سے سرحدی محافظ اپنے اپنے مورچوں میں دبکے بیٹھے ہوں گے، تاریک فضا میں برف کے تیرتے ہوئے ذرّوں کے درمیان سرمئی کمبل میں لپٹا ہوا وجود کسی کو نظر نہیں آئے گا۔

حاجی گونگے شاہ کا خیال غلط نہیں تھا۔ وہ کنٹرول لائن پر کھڑا تھا، لیکن کسی طرف سے کوئی گولی

نہیں آئی، کسی ٹارچ کی روشنی نہیں چمکی۔اس نے بہت سکون سے اپنا کمبل اتار کر زمین پر پھینکا اور شلوار کھول کر کنٹرول لائن کے چہرے پر پیشاب کی دھار کھینچ ماری۔اسے لگا جیسے سرحد کے دونوں طرف کی وادیاں احتجاجی نعروں سے گونج گئی ہوں۔سفید برف پر دور تک ایک موٹی پیلی لکیر پھیل کر جم گئی تھی۔وہ بالکل ہلکا پھلکا ہو گیا تھا۔اس نے اندر کا سارا زہر باہر نکال کر اس سرحدی لکیر پر پھیلا دیا تھا جہاں اس سے پہلے صرف خون کی دھاریں بہتی تھیں۔اس نے انتقام لے لیا تھا، اب وہ سکون سے مر سکتا تھا۔

حاجی گونگے شاہ نے بہت اطمینان سے اپنا ازار بند باندھا اور زمین سے کمبل اٹھانے جھکنے ہی والا تھا کہ دونوں طرف سے پھینکی گئی سرچ لائٹوں میں نہا گیا۔دونوں طرف سے اونچی اونچی آوازوں میں ''ہینڈز اپ'' اور ''ہاتھ اوپر اٹھاؤ'' کا شور مچ رہا تھا۔حاجی گونگے شاہ نے اطمینان کی سانس لی۔انھوں نے اسے دیکھتے ہی گولی نہیں ماری تھی۔اس نے ایسا کچھ کیا بھی نہیں تھا کہ مار دیا جاتا۔اس نے اپنے باپ اور تایا کی طرح سرحد پار کرنے کی کوشش نہیں کی تھی۔اس وقت اسے سردی کا احساس ہوا۔بدن اچانک ہی کانپنے لگا تھا۔وہ زمین سے کمبل اٹھانے کے لیے جھکا، اسی وقت دونوں طرف سے چلائی جانے والی گولیاں اس کے سینے اور کمر میں پیوست ہو گئیں۔وہ کسی درخت کی طرح خاموشی سے کنٹرول لائن پر گر گیا۔آدھا اس طرف اور آدھا اُس طرف۔''

لکھنے والے نے یہ کہانی یہیں ختم کر دی تھی۔اس کے بعد کیا کچھ ہوا تھا اسے لکھنا کہانی نویس کا نہیں صحافیوں کا کام تھا۔حاجی گونگے شاہ کی لاش دو دن تک کنٹرول لائن پر پڑی رہی تھی جہاں برف کے سفید فرش پر پیلی لکیر بھی چمک رہی تھی۔دونوں طرف والے لاش لینے سے گریزاں تھے۔وہ اپنی طرف والوں کو جلوس نکالنے کے لیے ایک اور لاش نہیں دینا چاہتے تھے۔اقوامِ متحدہ کے فوجی دستے نے دونوں طرف کے فوجیوں کو وہاں سے ہٹا کر اپنا مورچہ لگا لیا تھا۔حاجی گونگے شاہ کو کنٹرول لائن کے اسی مقام پر دفنا دیا گیا تھا جہاں اس کی لاش گری تھی۔جنازے کی نماز سرحد کے دونوں طرف پڑھی گئی تھی، ایک ہی وقت، بس نماز پڑھانے والے امام الگ الگ تھے۔اقوامِ متحدہ کی امن فوج کے نیلی ٹوپی والے فوجیوں نے قبر پر دونوں طرف سے چڑھائی جانے والی پھولوں کی چادروں پر بھی کوئی اعتراض نہیں کیا تھا۔کئی من پھولوں کے نیچے اطمینان سے سویا ہوا حاجی گونگے شاہ شاید گونگی بہری پریوں کے

خواب دیکھ رہا تھا۔

آج ۲۰۵۰ء میں اس واقعے کے پچاس برس گزرنے کے بعد بھی کنٹرول لائن اسی طرح موجود ہے۔ حاجی گونگے شاہ کا مزار بھی اسی طرح ہے بلکہ مزار پر سرحد کے دونوں طرف رونق کچھ زیادہ ہی بڑھ گئی ہے۔ اقوامِ متحدہ کی سفارش پر کئی سال پہلے وہاں سفید چکنے ٹائلوں کی ایک بڑی دیوار کھڑی کر دی گئی تھی جہاں زائرین آ کر حاجی گونگے شاہ کی روایت کا اعادہ کرتے ہیں۔ پہلی لکیر پختہ نالیوں سے سیراب ہو کر بارود کی بو دھونے کی کوشش کر رہی ہے۔

تاریخ کا سبق

''آج کیا تاریخ ہے؟'' جمال عزیزی نے خاموشی توڑی ساتھ ہی اپنا مراقبہ بھی۔
''۱۸ ستمبر! کیوں، کیا کسی کی سال گرہ یاد آ گئی؟'' کامریڈ علی نے ہلکی سی جماہی لے کر پوچھا۔
دونوں دیر سے کمرے کے سناٹے سے باتیں کر رہے تھے۔ جمال عزیزی کے دیوانیے میں خاموشی توڑنے والے آلات نہیں تھے۔ کمرے کے مکین خاموش ہو جاتے تو صرف سانسیں بولا کرتیں۔ خاموشی کا یہ دور کامریڈ علی کی موجودگی میں زیادہ گہرا ہو جاتا۔ دونوں کی دوستی برسوں پرانی تھی اور دونوں اپنے اس طویل ساتھ میں ایک دوسرے سے اتنا کچھ کہہ چکے تھے کہ شاید کہنے کے لیے کچھ بچا نہیں تھا۔
''تم نے بتایا نہیں ۱۸ ستمبر کو کیا ہوا تھا؟'' کامریڈ علی نے جمال عزیزی سے ایک بار پھر پوچھا۔
''آج کے دن ایک شہنشاہ نے اپنی قسمت کے ستاروں سے کھیلنے کی کوشش کی تھی اور ہار گیا تھا۔'' جمال عزیزی نے کہا اور ایک بار پھر مراقبے میں چلا گیا۔
کامریڈ علی کو حیرت ہوئی...... وہ جمال عزیزی کا چہرہ پڑھ سکتا تھا اور جانتا تھا کب وہ چپ رہتا ہے اور کب مراقبے میں۔ اس نے جمال عزیزی کو کبھی مراقبہ توڑتے نہیں دیکھا تھا، لیکن ۱۸ ستمبر کی تاریخ نے کچھ یاد دلا کر اسے ایک لمحے کے لیے بے چین کر دیا تھا۔ علی کو معلوم تھا اسے زیادہ دیر انتظار نہیں کرنا پڑے گا۔ جمال عزیزی کے ذہن میں تاریخ کے بوسیدہ اوراق پھڑ پھڑانا بند ہوں گے اور وہ تاریخ کی

اڑان بھر کر واپس آئے گا تو علی کو اپنے سفر کی کہانی سنائے گا۔

جمال عزیزی کے مراقبے کا یہ عمل کامریڈ علی کی موجودگی میں تقریباً ہر شام دو تین گھنٹے جاری رہتا، وقفہ صرف اُن دنوں میں آتا جب جمال عزیزی قومی اسمبلی کے اجلاس کے دوران اسلام آباد میں ہوتا۔ خاموشی کی یہ ورزش شروع بھی اس وقت ہوئی تھی جب جمال عزیزی پہلی بار منتخب ہوا تھا اور قومی اسمبلی کے اجلاس میں شرکت کر کے واپس آیا تھا۔ علی کو اس کی یہ اچانک خاموشی کچھ عجیب لگی تھی۔ اس کا خیال تھا کہ اسمبلی کا رکن بن کر جمال بدل گیا تھا۔ شاید اپنی سوچوں میں اسے شامل کرنے کے قابل نہیں سمجھ رہا تھا۔

''کچھ بولو! ورنہ خود کلامی اندر ہی اندر کھا جائے گی......'' علی کو جملہ لگانے کا موقع مل گیا تھا، لیکن پھر خود ہی شرمندہ ہوا تھا۔ اس نے اپنے بچپن کے دوست کو ایک بار پھر غلط پڑھا تھا۔

''میں خود کلامی کر ہی نہیں سکتا۔'' جمال عزیز نے قہقہہ لگا کر کہا تھا۔

''تمہیں جون ایلیا کا وہ شعر یاد ہے۔

کون اس گھر کی دیکھ بھال کرے
روز ایک چیز ٹوٹ جاتی ہے''

''کیا پیغمبرانہ شعر تھا۔'' علی نے سر دھن کر کہا۔

''اسی غزل میں جون نے خود کلامی کے بارے میں کہا تھا کہ جانِ من سانس پھول جاتی ہے۔ خود کلامی میرا بھی سانس پھلا دیتی ہے۔ پھیپھڑے درد کرنے لگتے ہیں۔''

''لیکن بات تو کرنا پڑے گی۔ نتیجوں پر پہنچنے اور فیصلے کرنے کے لیے سوچنا پڑتا ہے، خاص طور پر تم سیاست دانوں کو۔''

''سوچتے تم جیسے انقلابی ہیں کامریڈ۔ سیاست دان نہیں۔''

جمال عزیزی نے ایک اور قہقہہ لگایا تھا اور پھر سنجیدہ ہو کر کہنے لگا تھا ''میں آورد کا نہیں آمد کا قائل ہوں۔ مراقبے کے دوران میں تاریخ کے ہزاروں سال پرانے مقبرے میں سو جاتا ہوں۔ رومی شہنشاہ اور یونانی دیوتا مجھے لوریاں سناتے ہیں، وہ مجھے سوچنے نہیں دیتے۔''

جمال عزیزی کی تاریخ دانی ضرب المثل تھی۔ اسمبلی اور پارٹی دونوں جگہ اس کے ساتھی جو پہلے

اس کی تاریخ گوئی کا مزا لیتے تھے اب کترا کر نکل جاتے تھے۔ جمال عزیزی ہر سیاسی معاملے کی حقیقت سینکڑوں سال پرانے کسی تاریخی واقعے سے جوڑتا تو وہ شرمندہ ہو جاتے۔ ملک کا نظام چلانے والے ان سیاست دانوں کو اپنی بغلیں جھانکنا پسند نہیں تھا۔ جمال عزیزی خوش تھا کہ اسلام آباد میں قیام کے دوران اس کی تنہائی میں مخل ہونے والے کم ہو گئے تھے۔ وہ اب اسمبلی کے اجلاس میں بیٹھ کر بھی مراقبے میں جا سکتا تھا۔ کھلی آنکھوں سے سو سکتا تھا۔

کامریڈ علی اور جمال عزیزی اسکول اور کالج کے بعد یونیورسٹی میں بھی ساتھ پڑھے تھے۔ کامریڈ علی کے ساتھ جمال عزیزی نے بھی یونیورسٹی میں انقلاب انقلاب کھیلا تھا لیکن باپ کی اچانک موت کے بعد اسے اپنی آبائی نشست سنبھالنے سیاست میں آنا پڑا تھا۔ اسے دل چسپی نہیں تھی لیکن خاندان میں اس کے علاوہ کوئی اور نہیں تھا جو یہ سیاسی ورثہ سنبھال سکتا۔ یہ بھی ڈر تھا کہ کوئی اور طالع آزما موقع پا کر وہ نیک نامی خاک میں نہ ملا دے جو اس کے باپ دادا نے کمائی تھی۔ جمال عزیزی نے یہ احتیاط ضرور کی تھی کہ پارٹی میں رہتے ہوئے بھی الگ الگ رہا تھا اور پچیس تیس برس کے اس سیاسی سفر میں اس نے اپنا دامن غلاظتوں سے پاک رکھا تھا۔ کامریڈ علی کا انقلاب کب کا دال روٹی کی چکی میں پس کر غائب ہو گیا تھا۔ صرف کامریڈ نام کے ساتھ اٹکا رہ گیا تھا۔ یہ بھی جمال عزیزی کا دیا ہوا لقب تھا جو علی کو اپنی دوستی کی طرح عزیز تھا۔

کامریڈ علی نے اطمینان کی سانس لی کہ مراقبے کا وقت ختم ہو گیا تھا۔ جمال عزیزی نے اپنی خودکار کل پرزوں والی آرام کرسی کے ہتھے میں لگا ہوا بٹن دبا کر کرسی کی پشت سیدھی کی تھی، نفاست سے ترشی ہوئی انچ بھر لمبی سفید گھنی داڑھی پر ہاتھ پھیرا تھا اور اب مونچھوں کو تاؤ دے رہا تھا۔ گلفام جو شاید باہر دروازے سے کان لگائے کھنکا سننے کا منتظر تھا، چائے کی کشتی لیے ہوئے کمرے میں داخل ہوا۔ یہ مراکشی چائے کا وقت تھا۔ گلفام نے چائے کی دھار دو فٹ اوپر تک لے جا کر پیالی میں گرائی، پودینے کا ایک پتا چائے کی سطح پر تیرایا، کامریڈ علی کو بھی ایسی ہی چائے بنا کر پیش کی اور جس طرح آیا تھا اسی طرح دبے قدموں واپس چلا گیا۔

جمال عزیزی نے ایک گہرا سانس لے کر چائے کی خوشبو سونگھی، سر ہلا کر اطمینان ظاہر کیا اور ایک چھوٹا سا گھونٹ لے کر پیالی برابر کی چھوٹی میز پر رکھ دی۔ کامریڈ علی نے اپنی سماعتیں تیار

کرلیں، اسے پتا تھا جمال عزیزی کی تاریخ بیانی شروع ہونے والی ہے۔

''دو ہزار سال پہلے کی بات ہے۔ رومی شہنشاہ ڈومیشین پیدا ہوا تو اس کی زندگی کا زائچہ بنانے والوں نے اس کی موت کا دن بھی مقرّر کر دیا تھا۔ خونی موت ۱۸ ستمبر ۹۶ء، ٹھیک پانچ بجے جب چاند مریخ میں داخل ہوتا۔''

جمال عزیزی نے خاموش ہو کر چائے کی پیالی اٹھائی اور چھوٹے چھوٹے گھونٹ لے کر چائے کا مزا لینے لگا۔ کامریڈ علی بھی چائے پینے لگا تھا۔ اسے پتا تھا کہانی کے دوران ایسے کئی وقفے آئیں گے۔

''ڈومیشین کی زندگی پر موت کی پیش گوئی خوف بن کر مسلط ہو گئی تھی جس نے اسے ایک ظالم، جابر اور قہر کرنے والا بادشاہ بنا دیا تھا۔'' جمال عزیزی نے چائے کا آخری گھونٹ لے کر کہانی دوبارہ شروع کی۔

''ڈومیشین کو اپنے آباؤ اجداد کا یہ سبق اچھی طرح یاد تھا کہ اقتدار کے بھیڑیے کو دونوں کانوں سے پکڑ کر رکھو۔ لیکن ایک دن ڈومیشین نے بھیڑیے کے کان چھوڑ دیے اور گھڑی کی سوئیاں پکڑ کر لٹک گیا۔ ۱۸ ستمبر ۹۶ء کو ٹھیک پانچ بجے، جب چاند مرّیخ میں داخل ہو رہا تھا، ڈومیشین اپنے بستر پر خون میں لت پت بے جان پڑا تھا۔''

''زائچہ اتنا سچا تھا؟'' علی نے حیرت ظاہر کی۔

''ہو سکتا ہے اور شاید نہ بھی ہو۔ روم میں ہر شخص ڈومیشین کے قتل کی پیش گوئی اور زائچے کے ایک ایک حرف سے واقف تھا۔ ڈومیشین نے موت کا بازار گرم کر رکھا تھا۔ ہر شخص شبے کی زد میں تھا کھٹکا ہوتے ہی سر قلم ہونے لگتے۔ اسی لیے ہر شخص قتل کی سازش میں شریک ہو گیا تھا۔ اس کے معتمد، ملازم، محافظ، رشتے دار، حتیٰ کہ اس کی بیوی اور سینیٹ بھی۔ سب ڈومیشین کے قہر سے خوف زدہ تھے۔ قتل کی سازش کرنے والوں نے اپنی ہر چال موت کے زائچے میں لکھی گئی ستاروں کی چال کے مطابق چلی تھی۔ ڈومیشین کی خونی موت کے زائچے کو سچ ثابت کرنا اس کے ظلم کا نشانہ بننے والوں کا ایک انوکھا انتقام تھا۔'' جمال عزیزی ایک بار پھر خاموش ہو کر سامنے کی دیوار کو گھورنے لگا، جیسے اس پر ڈومیشین کے قتل کی فلم چل رہی ہو۔

''اس کی موت کا جو دن مقرّر تھا اس دن ڈومیشین نے خود کو اپنے کمرے میں محصور کر لیا تھا۔''

کہانی دوبارہ شروع ہوگئی تھی۔ ''پرندے کو پر مانے کی اجازت نہیں تھی۔ لیکن محل کی ہر گھڑی غلط وقت بجا رہی تھی۔ ہر گھڑی ایک گھنٹہ آگے تھی۔ ڈومیشین نے خادم کو بلا کر وقت پوچھا تو چھ بجے تھے۔ ڈومیشین نے اطمینان کی سانس لی۔ اس نے موت کا وقت ٹال دیا تھا، موت کی پیش گوئی غلط ثابت کر دی تھی۔ اس نے اپنے معتمد کو آنے کی اجازت دے دی جو کسی کا ضروری پیغام لانے کا بہانہ کر کے آیا تھا۔ اس نے اجازت ملتے ہی اندر آ کر خنجر کے پے در پے وار کر کے ڈومیشین کو اس کے انجام تک پہنچا دیا۔ اس وقت ٹھیک پانچ بج رہے تھے اور چاند مریخ میں داخل ہو رہا تھا۔''

کچھ دیر کے لیے خاموشی چھا گئی۔ شاید کمرے کا سناٹا ڈومیشین کا ماتم کر رہا تھا۔

''تاریخ کی اس کہانی کا سبق کیا ہے؟'' کامریڈ علی نے خاموشی توڑی۔ جمال عزیزی تاریخ کی ہر واردات سنانے کے بعد اس کا ماحصل ضرور بتاتا تھا۔

''پہلا تو یہ کہ اقتدار کا بھیڑیا بہت حساس ہوتا ہے۔ اس کے کان پکڑ کر رکھو لیکن اس زور سے نہ کھینچو کہ وہ ناراض ہو کر تمھاری چیر پھاڑ شروع کر دے۔''

''اور دوسرا......''

''گھڑی کی سوئیاں پکڑ کر لٹکنے سے وقت نہیں تھمتا۔''

''لیکن......'' کامریڈ کو جملہ پورا کرنے کا موقع نہیں ملا۔ اسی وقت گلفام ٹیلیفون ہاتھ میں لیے کمرے میں داخل ہوا تھا اور اس پر جمال عزیزی کی قہر آلود نگاہیں گڑ گئی تھیں۔

سب کو معلوم تھا کہ یہ تخلیے کا وقت تھا اور کمرے میں فون لانا منع تھا۔ جمال عزیزی کا رویہ اپنے معمولات اور انتظامات کے بارے میں بہت سخت تھا۔ اس کی حویلی کے باہری حصے میں اس کا دفتر تھا جہاں فون وصول کر کے پیغامات لیے جاتے تھے۔ کامریڈ علی کے جانے کے بعد مغرب سے عشاء تک کا وقت فون کالوں کا جواب دینے اور ملاقاتوں کا تھا، اس سے پہلے نہ اس کے بعد۔ گلفام جمال عزیزی کے ان معمولات میں پلا بڑھا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ نرم دل جمال عزیزی ڈسپلن توڑنے والوں کے ساتھ کس سختی سے پیش آتا تھا۔ رات گئے ملکی حالات کا ماتم کرنے والے نوکروں اور چوکی داروں کی مجلسوں میں وہ سینے پر ہاتھ مار کر کہتا تھا کہ میرے صاحب کو ایک دن کے لیے حکومت دے دو، وہ سب کو ٹھیک کر دیں گے۔

''گذدر صاحب کا فون ہے مالک۔'' گلفام نے ڈرتے ڈرتے کہا۔ خوف نے اس کا چہرہ اور سیاہ کر دیا تھا۔ اس کے نام اور شخصیت میں کوئی میل نہیں تھا۔

''گز بھر کا؟'' کامریڈ علی نے ہنس کو ماحول کا تناؤ دور کیا۔ وہ گذدر کو ہمیشہ گز بھر کہا کرتا تھا، شاید اس کی لمبی زبان اور لاف گزاف کی عادت کی وجہ سے۔ وہ سمجھ گیا کہ گلفام نے ڈسپلن توڑنے کا خطرہ کیوں مول لیا تھا۔ گذدر کا خوف ہی ایسا تھا۔ گذدر جمال عزیزی کی پارٹی کا چیئر مین تھا۔ پارٹی آج کل اقتدار میں تھی اور پارٹی اور حکومت میں گذدر کے حکم اور اشارے کے بغیر پتا نہیں ہلتا تھا۔ ملک کا وزیر اعظم بھی گذدری کٹھ پتلی تھا جسے معلوم تھا کہ گذدر کی نگاہِ کرم نے یہ عہدہ دیا ہے اور کرم کی یہ نگاہ پھر گئی تو وزارتِ عظمیٰ کی مجاوری ہاتھ سے نکل جائے گی۔

''گذدر صاحب نے کہا ہے...... لازم ہے...... اسی وقت......'' جمال عزیزی کا ہاتھ بڑھتا دیکھ کر گلفام نے جملہ ادھورا چھوڑا اور فون دے کر تیزی سے کمرے سے باہر نکل گیا۔ کامریڈ علی بھی جانے کے لیے اٹھ کھڑا ہوا۔ اس کا جمال عزیزی کی پارٹی اور اس کی سیاست سے کوئی تعلق نہیں تھا، نہ وہ اس گفتگو کا راز دار بننا چاہتا تھا لیکن جمال عزیزی نے اسے ہاتھ کے اشارے سے بیٹھنے کے لیے کہا اور فون پر رسمیات کے تبادلے کے بعد دوسری طرف سے جاری ہونے والے اپنے چیئر مین کے احکامات سنتا رہا۔ فون بند ہوتے ہی گلفام کمرے میں داخل ہوا اور فون لے کر بھاگتا ہوا کمرے سے نکل گیا۔

''اٹھنا پڑے گا۔ مجھے رات کی فلائٹ سے اسلام آباد جانا ہے۔ صبح آٹھ بجے گذدر صاحب سے ملاقات ہے، کوئی بہت اہم معاملہ ہے۔''

''مبارک ہو! تمھارے سر پر بھی اقتدار کی ہما بیٹھنے والی ہے۔ کس وزارت کی امید ہے؟'' علی نے مضحکہ اڑانے والے لہجے میں کہا۔

''تمھیں پتا ہے مجھے وزارت سے کبھی دل چسپی نہیں رہی۔'' جمال عزیزی نے سخت نظروں سے علی کو گھورتے ہوئے کہا۔ ''اور اقتدار ہما نہیں، گدھ ہے۔ زندہ گوشت کھانے والا گدھ! وہ سر میں پنجے گاڑ کر بیٹھتا ہے۔ پہلے بھیجا کھا کر کھوپڑی خالی کرتا ہے، پھر آنکھوں کے ڈھیلے پھوڑ کر نابینا کر دیتا ہے۔ اس کے بعد پورے جسم کا گوشت نوچتا ہے اور خالی ڈھانچہ چھوڑ کر اڑ جاتا ہے۔ لوگ ڈھانچے کو دفنانے نہیں، ٹھوکریں اور لاتیں مارنے آتے ہیں۔''

''اتنے سفاک مت بنو۔''

''سفاک میں نہیں ہوں مائی ڈیر ڈاکٹر وائسن! حقائق جو بہت بے رحم ہوتے ہیں۔ مسئلہ یہ ہے کہ تم تاریخ نہیں پڑھتے۔'' جمال عزیزی نے اٹھتے ہوئے کہا۔ کامریڈ علی معلوم تھا کہ آج کی شام وقت سے پہلے ختم ہوگئی ہے۔ تاریخ کا سبق ادھورا رہ گیا تھا۔

لیکن جمال عزیزی کی تاریخ بیانی کی تشنگی گذدر سے ملاقات کے دوران دور ہوگئی۔ گذدر نے ملتے ہی اس کے بجائے تاریخ کا احوال پوچھا تھا۔ جمال عزیزی دل میں حیران ہو رہا تھا کہ گذدر اچانک اتنا بدل گیا تھا۔ حیرت اس وقت شروع ہوئی تھی جب اسلام آباد ایئر پورٹ پر اس نے اپنے استقبال کا انتظام دیکھا۔ خود گذدر کا ذاتی سیکرٹری اسے وی آئی پی لاؤنج سے لیتا ہوا ہوٹل تک پہنچانے آیا تھا اور پھر وہی اسے صبح سیاہ چمک دار مرسڈیز میں ہوٹل سے گذدر ہاؤس لے کر آیا تھا جہاں گذدر اپنے خصوصی کمرے کے دروازے پر اس کے استقبال کے لیے موجود تھا۔ وہ مصافحہ کرنے کے بجائے بہت گرم جوشی سے بغل گیر ہوا تھا۔ جمال عزیزی کی چھٹی حس زور زور سے ٹھونگیں مار رہی تھی۔ کوئی خطرہ سر پر منڈلا رہا تھا۔ وہ سر اور داڑھی کے بالوں میں انگلیوں سے کنگھی کرتے ہوئے تخلیے کا انتظار کرنے لگا۔ ملازم کافی دے کر اور گذدر کا سیکرٹری اپنے پیچھے دروازہ بھیڑ کر چلا گیا تو گذدر نے اپنی مونچھوں سے کافی کا سفید جھاگ صاف کیا، دونوں ہاتھ اپنے سنگل سیٹ والے صوفے کے ہتھے پر رکھے اور بادشاہوں والا پوز بنا کر مخاطب ہوا۔

''جمال صاحب! تاریخ کا کوئی سبق؟''

''ایک ہی سبق ہے اور وہ بھی پرانا جو سب کو پتا بھی ہے۔ رات ٹی وی شو کا ایک میزبان بھی یہی سبق دہرا رہا تھا۔''

''ٹی وی والوں کی بات نہ کیجیے۔ ان کی جہالت انتہا کو پہنچ گئی ہے۔ میں جلد ان کے دماغ ٹھیک کرنے والا ہوں۔'' گذدر اپنے غصے پر قابو پانے کے لیے خاموش ہوا اور پھر اپنی مخصوص مسکراہٹ چہرے پر سجا کر پوچھنے لگا۔

''وہ کیا سبق ہے جو سب کو پتا ہے لیکن مجھے نہیں معلوم۔''

''یہی کہ تاریخ سے کوئی سبق نہیں سیکھتا۔''

''میں سیکھتا ہوں! میں سیکھتا ہوں!'' گنڈر نے اپنے سینے پر ہاتھ مار کر قہقہہ لگایا۔ ''مذاق چھوڑیے۔ آپ سب کو تاریخ کا سبق دیتے ہیں، اپنے چیئرمین کو کیوں محروم کرتے ہیں۔''

''مشکل سبق ہے، سیکھنا اور پھر عمل کرنا آسان نہیں ہوگا۔''

''پھر بھی!''

''جو آپ کے سب سے قریب ہیں انھیں جتنا ہو سکے دور رکھیے۔''

''جی؟''

''اپنے سائے سے ڈریے اور اس پر کڑی نگاہ رکھیے۔''

''یعنی میں......''

''میں صرف تاریخ سے سیکھا ہوا سبق سنا رہا ہوں۔ سکندرِ اعظم کی فتوحات کی بنیاد اس کے باپ فلیپ دوئم نے رکھی تھی جو میسیڈونیا کا بادشاہ تھا۔ سکندرِ اعظم اس کا دایاں ہاتھ تھا لیکن اس نے بادشاہ بننے کے لیے اپنے باپ کو قتل کرا دیا تھا۔''

''سکندرِ اعظم نے......؟''

''وہ بیس سال کی عمر میں اپنے باپ کا سب سے جیالا کمانڈر تھا لیکن اسے بادشاہ بننے کی جلدی تھی۔ اس کا باپ اس وقت ۴۷ برس کا تھا اور بھینسے کی طرح مضبوط۔ بیس تیس سال تک اس کے مرنے کا کوئی امکان نہیں تھا۔ سکندرِ اعظم کے پاس انتظار کا وقت نہیں تھا۔

''میں نے کہیں نہیں پڑھا کہ سکندرِ اعظم نے......''

''یہ ارسطو کی گڑبڑ تھی۔ وہ سکندرِ اعظم کا استاد تھا۔ اس نے قتل کو مقتول بادشاہ کی جنسی رقابتوں کا پردہ پہنا دیا تھا۔ حالانکہ سب شہادتیں سکندرِ اعظم کی طرف اشارہ کر رہی تھیں۔ قاتل کو اسی نے اکسایا تھا اور پھر قتل کے فوری بعد قاتل کو بھی قتل کروا دیا تھا۔''

''کمال ہے ارسطو بھی......!''

''اور جولیس سیزر کا قصہ تو تاریخ کی ضرب المثل ہے۔ جس آخری وار نے سیزر کی جان لی وہ اس کے سب سے وفادار بروٹس کا تھا۔''

''جب سیزر نے کہا تھا بروٹس تو بھی!''

''نہیں، یہ کہانی غلط ہے، صرف ڈرامہ نگاروں کی مکالمہ آرائی ہے۔ سیزر نے موت کے سامنے خود کو لاچار پا کر شرمندگی سے بچنے کے لیے اپنی عبا کے دامن سے چہرہ چھپالیا تھا۔ وہ مرنے سے پہلے دیکھ ہی نہیں سکا کہ آخری وار کس نے کیا۔''

''اوہ!''

''کلاڈیس بھی ایک رومی بادشاہ تھا جسے اس کی بیوی نے زہر دے کر مروایا تھا تا کہ اپنے بیٹے نیرو کو بادشاہ بنوا سکے جو اس کا سگا لیکن کلاڈیس کا سوتیلا بیٹا تھا۔ نیرو ۱۶ سال کی عمر میں بادشاہ بنا اور بادشاہ بننے کے صرف ڈھائی سال بعد اس نے اپنی اُس ماں کو قتل کروادیا جس نے اسے بادشاہ بنانے کے لیے اپنے شوہر کو مروادیا تھا۔''

''یہ وہی نیرو ہے جو روم کو جلتا ہوا دیکھ کر بانسری بجا رہا تھا۔''

''یہ بھی تمثیل نگاروں کی غلط بیانی ہے۔ نیرو نے آگ بجھانے کے لیے بہت کچھ کیا تھا لیکن جب آگ نہیں بجھ سکی تو اپنی ناکامی کا مرثیہ گایا تھا۔ وہ نیرو کی بانسری نہیں نوحہ گری تھی۔ وہ اچھا بادشاہ نہیں تھا لیکن ایک عظیم فن کار تھا۔''

''کمال ہے آپ تاریخ کی ہر ضرب المثال کو غلط ثابت کر رہے ہیں۔ تاریخ کے یہ راز صرف آپ پر کیسے ظاہر ہوتے ہیں؟''

''کھوج لگانے اور بین السطور پڑھنے سے۔ آپ بھی کوشش کیجیے، تاریخ کے کتنے سربستہ راز ہیں جو آپ پر کھل جائیں گے۔''

''میرے پاس وقت نہیں ہے۔ آپ بھی اب رومی سلطنت کے کھنڈروں سے باہر نکل آیئے۔ آج کا بین السطور پڑھیے۔ آج کی تاریخ سے کوئی فائل نکال کر بتایئے۔''

''تاریخ میں آج نہیں صرف کل ہوتا ہے۔ وہ بھی پرانا کل۔ میں ہزار برس سے اِدھر کے قصے کو تاریخ نہیں حالاتِ حاضرہ کا احوال مانتا ہوں۔''

''جو کچھ ہے وہ آج ہے۔ صرف آج۔ گزرا ہوا کل آپ کو کچھ نہیں دے گا۔ تاریخ کا سبق دینے والے تاریخ میں جگہ نہیں پاتے۔ مجھے دیکھیے میں آج میں اور آنے والے کل میں زندہ ہوں۔ میں اس ملک کی تاریخ بنا رہا ہوں۔''

''بے شک!'' جمال عزیزی کو اس موضوع پر بحث کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔ گندور نے تاریخ تاریخ کھیلنا شروع کیا تھا اور وہ اس کھیل میں شریک ہو گیا تھا۔ گندور پہلے اس سے تاریخ کا سبق لیتا رہا اور اب اپنا سبق پڑھا رہا تھا۔ جمال عزیزی کو معلوم تھا کہ گندور کو تاریخ سے کوئی دل چسپی نہیں اور نہ ہی وہ وقت ضائع کرنے کا قائل تھا۔ شاید کوئی بہت اہم بات تھی جسے کہنے سے پہلے سوچیں مجتمع کر رہا تھا۔

صوفے کے ہتھوں پر گندور کی گرفت جو کہ کچھ اور سخت ہو گئی تھی، اب آہستہ آہستہ ڈھیلی ہو رہی تھی۔ اس نے میز پر رکھے ہوئے سگار دان سے ایک سگار نکال کر سلگایا۔ جمال عزیزی کو سگار کی بو پسند نہیں تھی۔ اس نے سوچا چوہے بلی کا کھیل ختم کر کے اسے خود ہی اپنی طلبی کی وجہ پوچھ لینا چاہیے۔ لیکن اسے انتظار نہیں کرنا پڑا۔ گندور نے سوال خود اس پر پلٹ دیا تھا۔

''آپ کو معلوم ہے میں نے آپ کو کیوں بلایا ہے؟''

''ایئرپورٹ پر کسی رپورٹر نے شاید آپ کے سیکرٹری کو میرا استقبال کرتے دیکھ لیا تھا۔ میں نے صبح کے اخبار میں اپنے وزیر بنائے جانے کی خبر پڑھی ہے۔''

''اخباروں کی خبریں اکثر غلط ہوتی ہیں۔'' گندور نے ہنس کر کہا، لیکن پھر سنجیدہ ہو گیا۔ ''اگر یہ خبر صحیح ثابت ہوئی تو......؟''

''میں آپ کا شکریہ ادا کروں گا اور معذرت کر کے اجازت چاہوں گا۔''

''کیوں، آپ کو وزیر بننے سے اتنی چڑ کیوں ہے؟''

''چڑ نہیں، ذاتی مفاد! وزیر بنا تو اگلا الیکشن ہار جاؤں گا۔''

''اتنی بداعتمادی، وہ بھی خود پر!''

''ایسا نہیں ہے۔ اعتماد کی کمی نہیں ہے۔ کھیلنا بھی جانتا ہوں۔ لیکن سیاست کی بساط پر وزیر ایک ایسا مہرہ ہے جو پٹ جاتا ہے یا پٹوا دیا جاتا ہے۔ مجھے پٹا ہوا مہرہ بننا پسند نہیں ہے۔ میں ایک عام ممبر کی حیثیت سے اپنے حلقے کے لوگوں کی خدمت کر کے خوش ہوں۔''

''آپ کی رعایا آپ سے خوش ہے؟''

''میرے حلقے کے لوگ اپنے اپنے مسائل لے کر میرے پاس آتے ہیں، میں ان کی

درخواستوں پر متعلقہ وزیروں سے دستخط کروا دیتا ہوں۔ ہر وزیر اس ڈر سے جلدی جلدی دستخط کر دیتا ہے کہ میں اسے تاریخ کا سبق نہ پڑھانے لگوں......''

''آپ کی تاریخ دانی کام آ رہی ہے۔'' گندر نے قہقہہ لگایا۔

''جی ہاں!'' جمال عزیزی نے بدستور سنجیدہ رہتے ہوئے کہا۔''جس کا کام ہو جاتا ہے وہ مجھے دعائیں دیتا ہے۔جس کا نہیں ہوتا وہ اس وزیر کو معطون کرتا ہے۔جس کا محکمہ اپنے وزیر کا حکم نہیں مانتا......''

''آپ واقعی ایک اچھے شاطر ہیں۔'' گندر نے ایک اور قہقہہ لگایا، لیکن پھر ایک دم سنجیدہ ہو گیا۔''اور اگر میں آپ کو سیاست کی بساط پر مہرہ نہیں بادشاہ بنا دوں، آپ کو اس ملک کا وزیر اعظم بنا دوں......؟''

''میں آپ کی حسِ مزاح کی داد دوں گا......''

گندر خاموش رہا۔اس نے ایک آخری کش لے کر سگار ایش ٹرے میں مسل دیا اور گھڑی میں وقت دیکھنے کے بعد اپنے ہاتھ ایک بار پھر صوفے کے ہتّھوں پر جما دیے۔

''میں مذاق نہیں کر رہا۔میں شاہانی کا استعفیٰ صدر کو بھجوا رہا ہوں۔''

''وزیر اعظم شاہانی......؟''

''اس کے پر نکل آئے ہیں۔پوچھے بغیر فیصلے کرنے لگا ہے۔پارٹی میں اپنا گروپ بنا رہا ہے۔اسے پتا نہیں میں قد سے بڑھ جانے والے خود اپنے سائے کو بھی پاؤں تلے کچلنے کی قوّت رکھتا ہوں۔'' گندر کی آواز اونچی ہو گئی تھی، غصّے پر قابو پا کر اس نے اپنا لہجہ پھر دھیما کر لیا۔

''میں نے پارٹی کا وہ اوّلین فیصلہ قبول کر لیا ہے۔جس میں مجھ سے وزیر اعظم بننے کے لیے کہا گیا تھا۔آپ جانتے ہی ہیں کہ میں نے کیوں انکار کر دیا تھا۔مجھے حکومتی عہدہ نہیں چاہیے تھا۔میں پارٹی پر اپنی ساری توجہ رکھنا چاہتا تھا۔لیکن یہ شاہانی......اس کی نا اہلی نے پارٹی کی مقبولیت کا گراف گرا دیا ہے۔''

''مجھے یقین ہے آپ وزیر اعظم بن کر پارٹی کا جھنڈا پھر سے اونچا کر سکیں گے۔مبارک ہو۔'' جمال عزیزی کو سیاست کی اسی مصلحت بیانی سے نفرت تھی۔وہ کہنا پڑتا تھا جس پر یقین نہ ہو۔لیکن وہ ابھی تک یہ نہیں سمجھ پا رہا تھا کہ وہ خود اس معمّے کے کس خانے میں بیٹھا ہے......

''لیکن اس میں کچھ وقت لگے گا۔'' گنذر نے صوفے کے ہتھوں پر اپنی گرفت ڈھیلی کر کے کہا۔'' مجھے قومی اسمبلی کی نشست حاصل کرنا ہوگی۔''

''میری نشست حاضر ہے۔''

''مجھے آپ کی نشست نہیں چاہیے۔ میری اپنی آبائی نشست موجود ہے وہ کل خالی ہو جائے گی۔ لیکن ضمنی انتخابات ہونے اور میرے نشست سنبھالنے کے عمل میں تین مہینے لگ جائیں گے۔ اس عبوری دور میں وزیراعظم کا عہدہ آپ سنبھالیں گے۔...... بیچ میں مت بولیے......'' گنذر نے ہاتھ اٹھا کر جمال عزیزی کو بولنے سے روک دیا۔'' یہ چیئرمین کی حیثیت سے میرا فیصلہ ہے۔ مجھے یقین ہے آپ پارٹی ڈسپلن کی خلاف ورزی نہیں کریں گے۔''

جمال عزیزی احتجاجاً کچھ کہنا چاہتا تھا لیکن گنذر اپنی جیب سے موبائل نکالتا ہوا اٹھ کھڑا ہوا۔

''مجھے ایک ضروری فون کرنا ہے، میں پانچ منٹ میں واپس آؤں گا۔ آپ کے پاس فیصلہ کرنے کے لیے صرف یہی پانچ منٹ ہیں۔''

گنذر کمرے سے نکلا تو نوکر نے گرم کافی کی ایک اور پیالی جمال عزیزی کے سامنے لا کر رکھ دی۔ اسے ضرورت بھی محسوس ہو رہی تھی۔ شاید سوچنے میں مدد کر سکے، لیکن صرف یہی سوچ سکا کہ کیا سوچے اور سر پر پھڑ پھڑاتے ہوئے اقتدار کے گدھ کو اڑانے کے لیے سر پر ہاتھ پھیرتا رہا۔ جمال عزیزی جانتا تھا کہ گنذر نے اس کا انتخاب کیوں کیا تھا۔ گنذر جانتا تھا کہ جمال عزیزی کو اقتدار کی خواہش ہے نہ شوق۔ اس کا اپنا کوئی گروپ بھی نہیں تھا۔ اس کا سیاسی کیریئر بے داغ تھا، کوئی انگلی نہیں اٹھا سکتا تھا۔ گنذر کو یقین ہوگا کہ جمال عزیزی تین مہینے بعد خاموشی سے تاریخ کے مقبرے میں واپس چلا جائے گا۔

گنذر واپس آیا تو اپنے صوفے پر پہلے کی طرح اکڑ کر بیٹھ گیا اور جمال عزیزی کی طرف دیکھنے لگا جیسے جواب مانگ رہا ہو۔

''شاہانی صاحب استعفیٰ دینے پر تیار ہو جائیں گے؟''

''دے چکے ہیں!'' گنذر پورے دانت کھول کر مسکرایا۔'' اس نے وزیراعظم بننے سے پہلے وفاداری دکھانے کے شوق میں بغیر تاریخ کا استعفیٰ لکھ کر مجھے دیا تھا۔ میں آج شام ہی صدر کو بھیج رہا

ہوں۔ وہ آج ہی منظور کر کے نوٹیفکیشن جاری کر دیں گے۔''

جمال عزیزی کو معلوم تھا صدر بھی گدڑ کا نیاز مند اور وفادار تھا۔ شاہانی بھی ایسی لڑائی نہیں لڑے گا جو وہ جیت نہیں سکتا۔

''میری ایک شرط ہے۔'' جمال عزیزی نے سر پر ہاتھ پھیرنا بند کر دیا تھا۔

''شرط!'' گدڑ حیرت سے چلایا۔ ''لوگ وزیر بننے کے لیے اپنی روح میرے پاس گروی رکھ جاتے ہیں، میں آپ کو ملک کا وزیر اعظم بنا رہا ہوں، تاریخ میں آپ کا نام درج کر رہا ہوں اور آپ شرط رکھ رہے ہیں۔''

میں کوئی ایسا کام نہیں کروں گا جو قانون کے خلاف ہو۔'' جمال عزیزی نے کوئی اثر لیے بغیر کہا۔

''بس؟'' گدڑ نے زور دار قہقہہ لگایا۔ ''آپ کو کام کرنے کی ضرورت ہی نہیں ہوگی۔ نہ قانونی نہ غیر قانونی۔ وزیر اعظم ہاؤس کا عملہ بہت تجربہ کار ہے، وہ سب سنبھال لے گا۔ آپ وزیر اعظم بن کر عیش کیجیے، تین مہینے چٹکی بجاتے گزر جائیں گے۔''

جمال عزیزی نے کچھ کہنا چاہا لیکن گدڑ نے اٹھ کر اسے گلے لگالیا۔

''مسٹر پرائم منسٹر...... مبارک ہو!''

سب کچھ اسی طرح ہوا تھا جس طرح گدڑ نے چاہا تھا۔ اس کے لیے قومی اسمبلی کی سیٹ خالی ہوگئی تھی اور ضمنی انتخابات کا اعلان ہو گیا تھا...... شاہانی نے چوں نہیں کی تھی اور استعفیٰ منظور ہوتے ہی وزیر اعظم ہاؤس خالی کر کے اپنے آبائی گاؤں جا کر گوشہ نشین ہو گیا تھا۔ جمال عزیزی اس کے دو دن بعد قومی اسمبلی سے اعتماد کا ووٹ حاصل کر کے وزیر اعظم ہاؤس منتقل ہو گیا تھا۔

وزیر اعظم بننے سے ایک روز پہلے وہ اپنے آبائی گھر گیا تھا۔ اپنے حلقے کا دورہ کر کے مبارک بادیں وصول کی تھیں اور شام کو دیوانیے میں کامریڈ علی کے ساتھ الوداعی مراقبہ کیا تھا۔ علی نے رخصت ہوتے ہوئے نصیحت کی تھی۔

''سر پر فولادی ہیلمٹ ضرور پہن لینا۔ تمھارا بھیجا اقتدار کے گدھ کی چونچوں سے محفوظ رہے گا۔''

''میرا دیا ہوا سبق مجھے ہی پڑھا رہے ہو۔'' جمال عزیزی ہنسا لیکن علی کے جانے کے بعد اداس ہو گیا تھا۔ اسے معلوم تھا وہ جب تک وزیراعظم رہے گا اس کا انقلابی دوست اس سے ملنے نہیں آئے گا۔

جمال عزیزی اپنے ساتھ سامان میں صرف گلفام کو باندھ کر لایا تھا۔ جانے سے ایک رات پہلے گلفام نے محلّے کے چوکی داروں اور نوکروں سے مبارک باد وصول کرتے ہوئے سینہ ٹھوک کر کہا تھا ''اب دیکھنا سب کچھ کیسے ٹھیک ہوتا ہے۔''

جمال عزیزی جانتا تھا وہ کچھ ٹھیک نہیں کر سکے گا۔ ہر طرف اتنا ملبہ اور اتنی غلاظت پھیلی تھی کہ صفائی کے لیے تین مہینے کیا تین سال بھی کم تھے۔ اور پھر منڈیروں پر بیٹھے ہوئے چیل کوے اور گدھ، ہر طرف بھن بھن کرتی مکھیاں۔ جمال عزیزی نے صفائی کی ابتداء گھر سے کی تھی۔ کابینہ مختصر رکھی تھی۔ صرف وہ لوگ جن کی شہرت زیادہ خراب نہیں تھی۔ نئی تقرریاں اور تبادلے کیے تھے۔ وزیراعظم ہاؤس کا عملہ بدل دیا تھا۔ سب کو بلا کر صرف ایک نکاتی ایجنڈا دیا تھا کہ کوئی کام قانون اور قاعدے کے خلاف نہیں ہوگا۔ ہوا تو صرف نوکری نہیں جائے گی، مقدمہ قائم کر کے جیل بھی بھجوا دیا جائے گا۔

نئے وزیراعظم کے لہجے کی سختی سے سب متاثر ہوئے تھے لیکن کسی نے زیادہ سنجیدگی سے نہیں لیا تھا۔ سب کو پتا تھا صرف دو تین مہینے کی چاندنی ہے، لیکن جب پہلے ہی مہینے میں دو سرکاری ملازم جیل پہنچ گئے اور ایک وزیر کو اپنے خلاف مقدمہ قائم ہونے پر استعفیٰ دینا پڑا تو سب چوکنے ہو گئے۔ آہستہ آہستہ سہی، حکومتی کلچر میں تبدیلی کے آثار پیدا ہونے لگے تھے۔

گنذور تک سب خبریں پہنچ رہی تھیں...... شروع کے ایک مہینے تک اس نے مداخلت نہیں کی لیکن جب شکایت کرنے والوں کا حلقہ تنگ ہونے لگا تو اس نے فون کیا تھا۔

''جمال صاحب! آپ کیا کر رہے ہیں۔ پارٹی میں بے چینی پھیلی ہوئی ہے۔ میں اپنی انتخابی مہم چلاؤں یا آپ کے خلاف کچہری لگاؤں۔''

''چیئرمین صاحب! میں جو کچھ کر رہا ہوں آپ کے لیے۔ میں نہیں جانتا لوگ کس بات کی شکایت کر رہے ہیں۔''

''آپ نے کابینہ مکمل نہیں کی۔ لوگوں کے کام نہیں ہو رہے۔ فائلیں آپ کے دفتر سے باہر نہیں نکلتیں، پارٹی کے لوگوں کو ملنے کا وقت نہیں دیتے......''

''صرف وہ کام رکے ہیں جو قاعدے کے مطابق نہیں تھے۔ میں نے آپ سے پہلے ہی کہا تھا۔''

''اور وہ وزارتیں! آپ کو معلوم ہے آپ نے پارٹی کے کتنے اہم لوگوں کو انتظار میں رکھا ہوا ہے۔ وہ حلف اٹھانے کے لیے بے تاب ہو رہے ہیں۔''

''صرف چند ہفتوں کی بات ہے۔ یہ وزارتیں خالی رہیں تو آپ کو آ کر اپنی پسند کے لوگوں کو چننے میں آسانی رہے گی ورنہ آپ انہی لوگوں کے ہاتھوں بندھ جائیں گے۔ آپ ہر عذاب میرے سر پر ڈال دیجیے، میں سنبھال لوں گا۔''

''دیکھیے......''

''چیئر مین صاحب! مجھ پر اعتماد رکھیے۔ یہ کرسی آپ کی امانت ہے۔ میں چاہتا ہوں جب آپ اس پر بیٹھیں تو یہ صاف شفاف ہو۔ اس پر بدانتظامی اور بے ایمانی کی گرد نہ چڑھی ہو۔''۔

گندور نے اُدھر سے فون بند کیا تو جمال عزیزی نے سوچا اسے دیر تک کلیاں کرنا پڑیں گی۔ منہ بدمزہ ہو گیا تھا۔ پتا نہیں کہ گندور قائل ہوا تھا یا نہیں۔ جمال عزیزی کو پرواہ نہیں تھی۔ اسے پتا تھا بچے ہوئے ایک ڈیڑھ مہینے میں گندور اس کے خلاف کچھ نہیں کرے گا۔ وہ اپنی انتخابی مہم کے دوران میں کوئی سیاسی بحران کھڑا نہیں کر سکتا تھا۔ میڈیا میں حکومت کی نیک نامی کا چرچا بھی ہو رہا تھا۔ گراف اوپر جا رہا تھا۔ جمال عزیزی کو بھی صفائی کا کام قومی خدمت لگنے لگا تھا۔ وہ تو صرف ہلکی ہلکی جھاڑو مار رہا تھا۔ ضرورت ایک طاقت ور ویکیوم کلینر کی تھی جو ایک اُلٹا سانس لے کر ساری گندگی اپنے اندر کھینچ لائے۔

اگلے چند ہفتوں تک گندور کا کوئی فون نہیں آیا۔ اس کا مخالف امیدوار توقع کے برعکس کڑا مقابلہ کر رہا تھا لیکن الیکشن سے صرف دس دن پہلے صبح ہی صبح فون آ گیا......

''میں شام کو ملنے آ رہا ہوں۔ مکمل تخلیہ رکھیے۔ کسی کو پتا نہ چلے۔''

گندور نے جواب سنے بغیر فون بند کر دیا تھا۔ جمال عزیزی کو معلوم ہوا تھا کہ گندور اس سے اعلانیہ ملنے کی غلطی نہیں کرے گا۔ اپوزیشن اور میڈیا شور مچا دیں گے کہ حکومت اس کی انتخابی مہم میں مدد کر رہی ہے۔ جمال عزیزی کو وزیر اعظم ہاؤس میں گندور کی آمد کو خفیہ رکھنے کا پورا بندوبست کرنا پڑا

تھا۔ گنذر گاڑی سے اتر کر تیزی سے اندر آیا تھا۔ اس نے چادر لپیٹی ہوئی تھی، آنکھوں پر کالا چشمہ اور سر پر بیس بال کے کھلاڑیوں والی ٹوپی تھی۔ اسے پہچاننا آسان نہیں تھا۔ اس نے اندر آتے ہی ٹوپی، چشمہ اور چادر اتار کر پھینکی اور بیٹھتے ہی صوفے کے ہتھوں پر اپنے ہاتھ سختی سے جما دیے۔ نظریں جمال عزیزی کے چہرے پر گڑی تھیں۔ چند منٹ بعد اس نے اپنی گرفت ہلکی کی، نظریں بھی ہٹا لیں اور جیب سے سگار نکال کر اس کا سرا چبانے لگا۔ جمال عزیزی کو معلوم تھا کہ وہ توپ داغنے سے پہلے نشانہ درست کر رہا تھا۔ سگار سلگا کر اور دو تین گہرے کش لے کر بولا لیکن فائر نہیں کیا۔

''آپ کا کلاک ساڑھے چار بجا رہا ہے، کیا یہ صحیح ہے؟ آپ کے پاس کیا وقت ہے؟''

''ساڑھے چار!'' جمال عزیزی نے اپنی دستی گھڑی دیکھتے ہوئے کہا۔ ''کیوں، آپ کو کہیں پہنچنا ہے؟''

''نہیں! صبح میرے ملازم نے میری گھڑی گرا دی تھی، وہ رک گئی ہے۔ کار کی گھڑی بھی جرمنی کا وقت بجا رہی ہے۔ میرے نجومی نے کہا ہے آج پانچ بجے کا وقت میرے لیے خطرناک ہے۔ اس وقت چاند جانے کہاں داخل ہو رہا ہوگا۔ یہ منحوس گھڑی گزرنے تک میں آپ کے ساتھ ہوں۔''

''آپ ستاروں کی چال پر یقین رکھتے ہیں؟''

''نہیں! لیکن اپنے ستاروں کے چال چلن کا پتا رکھتا ہوں۔ اکثر احتیاط کام بھی آ جاتی ہے۔''

''آپ کا نجومی کون ہے؟''

''سیّد بادشاہ حسین!''

''کالا سیّد؟''

''آپ اسے جانتے ہیں؟''

''علمِ نجوم میں میرا برخوردار ہے۔ اسے ستاروں کی چالیں میں نے ہی سکھائی تھیں۔''

''آپ کو اس میں بھی دخل ہے؟''

''تاریخ پڑھنے سے پہلے یہی شوق تھا۔ وقت ملا تو آپ کا زائچہ بناؤں گا۔''

''میرا سیکورٹی چیف ان زائچوں سے بہت چڑتا ہے۔ سیّد کی پیش گوئیاں اس کا سیکورٹی نظام گڑبڑ کر دیتی ہیں۔ بتا رہا تھا وہ بھی آپ کے علاقے کا ہے۔''

''فقیر محمد! اس کا خاندان ہمارے خاندان کا پرانا نمک خوار رہا ہے۔ وہ سب آج بھی میرے وفادار ووٹر ہیں۔''

''مجھے اپنا محافظ اور نجومی دونوں بدلنا پڑیں گے۔'' گنڈر نے اپنا مخصوص قہقہہ لگایا۔ ''میں پانچ بجے کا وقت گزار کر جاؤں گا۔ ابھی ایک گھنٹہ باقی ہے۔ جب تک آپ مجھے تاریخ کا کوئی سبق پڑھایئے۔''

''جمال عزیزی کو معلوم تھا کہ گنڈر کو تاریخ پڑھانا بھینس کے آگے بین بجانا تھا، لیکن گنڈر اس کے ساتھ چوہے بلی کا کھیل کھیلنا چاہتا تھا تو یہی سہی، جمال عزیزی دل ہی دل میں مسکرایا کہ دونوں اس کھیل میں خود کو بلی سمجھ رہے تھے۔ جمال عزیزی نے تاریخ کے کئی سبق دہرائے لیکن گنڈر کے لیے نہیں، شاید خود اپنے لیے۔ اس نے جبر اور قہر کرنے والے بادشاہوں کی جگہ ان حکم رانوں کے قصے سنائے تھے جن کی دانش مندی نے تاریخ کو روشن رکھا تھا۔ گنڈر نے اس عرصے میں کئی بار اپنا سگار جلایا اور بجھایا تھا۔ گلفام نے کافی کے دو دور چلائے تھے۔ کلاک نے ٹن کر کے ایک گھنٹہ گزرنے کا اعلان کیا تو دونوں چونک پڑے۔

''ساڑھے پانچ بج گئے ہیں۔ میں نے ایک بار پھر ستاروں کو مات دے دی ہے۔'' گنڈر نے اٹھتے ہوئے کہا اور میز سے ٹوپی اور چشمہ اٹھا کر پہننے کے بعد جسم پر چادر لپیٹنے لگا۔ جمال عزیزی بھی اٹھ کھڑا ہوا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ وہ فائرنگ کیے بغیر چلا جائے گا، لیکن اسے انتظار نہیں کرنا پڑا۔

''میں نے اپنے حلقے کے دو افسروں کا تبادلہ کرنے کی ہدایت بھجوائی تھی، آپ نے اب تک احکامات جاری نہیں کیے۔'' گنڈر نے چشمہ اتار کر اور جمال عزیزی کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر گولہ باری شروع کی۔

''آپ کی وجہ سے۔'' جمال عزیزی نے بہت ادب سے جواب دیا۔ ''آپ بڑے مارجن سے جیتیں گے۔ عین انتخابی مہم میں تبادلے ہوئے تو میڈیا اور اپوزیشن آپ کی کامیابی کے دودھ میں مینگنیاں بھر دیں گے۔''

''یہ الیکشن جیتنے کا نہیں، اختیار ثابت کرنے کا معاملہ ہے۔ اور وہ انٹرنیشنل ٹنڈرنگ؟ میں نے آپ سے کہا تھا کہ کوئی پروجیکٹ ٹنڈرنگ میں نہیں جائے گا۔ میں خود آ کر دیکھوں گا۔ یہ بھی آپ نے

میری وجہ سے کیا ہے؟''

''بالکل! ڈیڈ لائن آ گئی تھی۔ ٹنڈر نہیں مانگے جاتے تو فنڈز منجمد ہو سکتے تھے۔ ٹنڈر نگ پروسیس ہونے میں دو تین مہینے لگیں گے۔ اس سے پہلے آپ خود وزیراعظم ہوں گے، آپ کو فیصلہ کرنے کا اختیار ہوگا۔''

''عزیزی صاحب!'' گذدر نے اونچی آواز اور سرد لہجے میں کہا۔ ''میں بہت مشکل سے وقت نکال کر اور دیکھے جانے کا خطرہ مول لے کر صرف دو باتیں بتانے آیا ہوں۔ کل صبح تک دونوں کام ہو جانے چاہئیں۔ دونوں افسروں کا تبادلہ اور ٹنڈر نگ پروسیس کی منسوخی!''

''جی! جیسا آپ کہیں۔''

''کل صبح تک، ہر صورت میں!''

''بالکل! یقیناً!''

گذدر کو یقین نہیں آ رہا تھا کہ جمال عزیزی کوئی بحث کیے بغیر بلا چوں و چراں دونوں باتیں مان گیا تھا۔ اس نے آگے بڑھ کر جمال عزیزی کو گلے لگا لیا۔

''میں جانتا تھا آپ میرے اعتماد کو ٹھیس نہیں پہنچائیں گے۔''

جمال عزیزی گذدر کو رخصت کرنے دروازے تک آیا۔ گذدر نیلے رنگ کی کالے شیشوں والی بے نشان کار میں آیا تھا۔ جمال عزیزی کچھ دیر کھڑا جاتی ہوئی کار کو دیکھتا رہا۔ واپس کمرے میں آ کر بھی خاموش کھڑا رہا۔ خالی الذہنی کی کیفیت تھی۔ مراقبے کی ضرورت محسوس ہو رہی تھی، لیکن وقت نہیں تھا۔ کچھ دیر بعد وقت کا پہیہ تیزی سے گھومنے والا تھا۔ منہ کی کڑواہٹ تلخ کافی ہی دور کر سکتی تھی۔

گلفام دیوار پر لگے کلاک کی سوئیاں ایک گھنٹہ پیچھے کی طرف موڑ کر واپس چلا گیا۔ جمال عزیزی نے بھی اپنی دستی گھڑی کا وقت صحیح کیا اور تین گہری سانسیں لے کر آنے والے وقت کے لیے تیار ہو گیا۔ اس کی تنہائی کے یہ لمحات جلد ختم ہونے والے تھے۔ کچھ ہی دیر میں کمرہ پارٹی کے رہنماؤں سے بھر جائے گا۔ آٹھ بجے مسلح افواج کے تینوں سربراہ دفاعی معاملات پر بریفنگ دینے آنے والے تھے۔ اس میٹنگ کا کسی کو علم نہیں تھا۔ گذدر کو بھی نہیں۔ رات کو بارہ بجے عزیز جمالی کو ریڈیو ٹی وی پر قوم سے خطاب کرنا تھا۔ اس کا بھی کسی کو علم نہیں تھا۔ ریڈیو ٹی وی کو بھی نہیں۔ لیکن جمال عزیزی کو معلوم تھا

کہ ایک گھنٹے کے نوٹس پر تمام انتظامات ہو سکتے تھے۔ جمال عزیزی نے اندر کی جیب سے اپنی تقریر نکالی۔ اس کے پاس یہی دس پندرہ منٹ تھے جب وہ قوم سے اپنے خطاب کی نوک پلک درست کر سکتا تھا۔

جمال عزیزی نے تقریر لپیٹ کر واپس جیب میں رکھی ہی تھی کہ اس کا ملٹری سیکرٹری تیزی سے اندر داخل ہوا۔

''ایکسیلنسی! چند منٹ پہلے ایک نیلی کار بم دھماکے سے تباہ ہوگئی ہے۔ ایجنسی کی خبر ہے کہ اس میں گنڈور صاحب موجود تھے۔''

''کرنل جمشید! کنفرم کر کے بتایئے۔ جلدی!'' جمال عزیزی نے کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔ ملٹری سیکرٹری کے جانے کے بعد اس نے ایک بار پھر تین گہرے سانس لیے اور نئی تاریخ لکھنے کے لیے تیار ہو گیا۔ اسی وقت وزیر اعظم کے تمام ٹیلیفون ایک ساتھ بج اٹھے۔ گھنٹیاں زور زور سے چیخ رہی تھیں اور بھاگتے ہوئے قدموں کی آوازیں نزدیک آ رہی تھیں۔ جمال عزیزی نے دیوار پر لگی گھڑی کی طرف دیکھا۔ پانچ بج چکے تھے، چاند مریخ میں داخل ہو گیا تھا۔

لپ اسٹک

''مان جا رُخ! لپ اسٹک لگوا لے۔'' کمو نے ایک بار پھر دلہن بنی ہوئی چھوٹی بہن کی منت کی۔

رخسار نے لپ اسٹک لگوانے سے انکار کر کے میک اپ کا کام رکوا دیا تھا۔ کمو نے بہت سمجھایا تھا لیکن اس کا ایک ہی جواب تھا ''مجھے گھن آتی ہے۔'' للّی، جسے کمو نے بڑی مشکل سے گھر آ کر دلہن کا میک اپ کرنے کے لیے تیار کیا تھا، کمرے سے متصل بالکونی میں کھڑی سگریٹ کا دھواں اڑا رہی تھی اور سوچ رہی تھی یہ کیسے لوگ ہیں جن کے مرد بھی سگریٹ نہیں پیتے۔ کمو نے اسے سگریٹ نکالتے دیکھ کر شروع ہی میں سمجھا دیا تھا ''اس کمرے میں رسمیں ہونا ہیں، سگریٹ کا دھواں بس گیا تو یہاں کوئی نہیں رکے گا۔ ہمارے یہاں کوئی سگریٹ نہیں پیتا۔''

للّی نے کچھ نہیں کہا تھا، خاموشی سے سگریٹ واپس پیکٹ میں رکھ دیا تھا۔ کمو نے اسے بعد میں بالکونی میں جا کر سگریٹ پینے کی اجازت دے دی تھی۔ اسے ڈر تھا نکوٹین کی کمی سے میک اپ ادھورا نہ رہ جائے۔ لیکن اسے اب غصہ آ رہا تھا۔ رخسار کے لپ اسٹک نہ لگوانے کی ضد نے ٹائم ٹیبل خراب کر دیا تھا۔ دلہن کے بعد کمو کو اپنا میک اپ کروانا تھا۔ اماں بھی قطار میں لگی تھیں۔ پچھلے سال کمو کی شادی پر کسی نے اماں سے کہہ دیا تھا ''آپ کمو کی ماں نہیں بہن لگتی ہیں۔'' وہ آج للّی سے میک اپ کروا کے اپنی

چھوٹی بیٹی کی بھی ماں نہیں بڑی بہن لگنا چاہتی تھیں۔

سوال یہ ہے کہ رخسار اتنی ضد کیوں کر رہی تھی؟ شادی اس کی پسند سے ہو رہی تھی۔ ہر تقریب میں اس کا موڈ اچھا رہا تھا۔ نانی ماں اپنا منہ پیٹتی رہ گئی تھیں پھر بھی وہ ان کی پروا کیے بغیر لڑکے لڑکیوں کے ساتھ رات گئے تک ناچتی رہی تھی، لیکن اب لپ اسٹک پر آ کر اڑ گئی تھی۔ مہندی نہ لگواتی تو سمجھ میں آتا۔ اکثر لڑکیوں کو اس کی بو پسند نہیں ہوتی۔ لڑکیاں اب ابٹن بھی نہیں لگواتیں۔ خود اس نے اپنی شادی میں انگلی سے چھوا کر رسم پوری کی تھی۔ رخسار نے تو پوری رات بیٹھ کر بڑے شوق سے مہندی لگوائی اور ہلدی والے دن خوب ابٹن بھی ملوائی تھی، لیکن اسے لپ اسٹک سے گھن آ رہی تھی۔

''تم نے مجھے آج تک کبھی لپ اسٹک لگائے دیکھا ہے؟'' رخسار نے بہن کو منانے کی کوشش کی۔

''میں نے تجھے آج تک دلہن بنے بھی نہیں دیکھا تھا۔'' کمو پھٹ پڑی، لیکن پھر نرمی سے سمجھانے لگی۔ ''لپ اسٹک کے بغیر تیرا میک اپ ادھورا رہ جائے گا، تو ادھوری دلہن لگے گی۔ آج جو تصویریں کھنچیں گی اور ویڈیو بنے گا ان میں تو بالکل اجاڑ لگے گی۔ اور پھر دولہا والے کیا کہیں گے؟''

''دولہا والے غیر نہیں ہیں، ہمارے ہی آنٹی انکل اور بھائی بہن ہیں۔'' رخسار کی شادی اس کے سگے خالہ زاد بھائی سے ہو رہی تھی۔ دونوں طرف کے لوگ تقریباً ایک ہی تھے۔

کمو اسے بے بسی سے دیکھنے لگی۔ اسی وقت للی اپنا سگریٹ ختم کر کے واپس آ گئی۔ اس کی سمجھ میں آ گیا تھا کہ مسئلہ کیا ہے۔ اسے پتا تھا بڑے گھروں کی اکثر پڑھی لکھی لڑکیاں آج کل شرعی معاملات میں وہمی ہو گئی تھیں۔ اور پھر یہ گھرانہ...... جہاں کوئی سگریٹ تک نہیں پیتا!

''آپ فکر مت کیجیے، میرے پاس مسئلے کا حل ہے۔'' للی نے اپنے سامان سے ایک نیا ڈبہ نکالا اور اس میں شادی کے جوڑے سے میچ کرتی ہوئی لپ اسٹک تلاش کرنے لگی۔ ''یہ حلال لپ اسٹک ہے، خاص طور پر مسلمان عورتوں کے لیے بنائی جاتی ہے۔ میں ملائیشیا سے منگواتی ہوں۔ اسے بنانے میں کوئی ایسی چیز شامل نہیں جس پر شبہ کیا جا سکے۔ دیکھیے اس پر حلال کی اسٹیمپ بھی لگی ہے۔'' للی نے ایک لپ اسٹک نکال کر رخسار کی طرف بڑھائی۔ ''اِس کی کوالٹی بھی بہت اچھی ہے۔ یہ چھٹتی ہے نہ پھیلتی ہے، آسانی سے صاف بھی ہو جاتی ہے۔''

''یہ حرام حلال کا معاملہ نہیں ہے۔'' رخسار نے اس کا لپ اسٹک والا ہاتھ اپنے سامنے سے ہٹا

کر کہا۔ ''مجھے بس گھن آتی ہے۔ آپ میرا باقی میک اپ کر دیں۔''

اسی وقت اماں اور نانی ماں کمرے میں آ گئیں۔ کمو کا غصہ ماں پر اترنے لگا۔

''اماں! رُخ کو سمجھائیے۔ یہ لپ اسٹک لگوانے سے انکار کر رہی ہے۔ آدھے گھنٹے سے میک اپ کا کام رکا ہوا ہے۔ مجھے نہیں لگتا آج اس کی شادی ہو پائے گی۔''

''قمر جہاں! کیا دیوانی ہوگئی ہے۔ منہ سے اچھی فال نکال لڑکی۔'' نانی ماں کو غصہ آ گیا۔ ''لپ اسٹک کے بغیر کیا شادی نہیں ہو سکتی؟ کیا قرآن میں حکم آیا ہے؟ فیشن کی مار ہو تم سب پر......''

''ٹھیک ہے ٹھیک ہے!'' اماں نے اپنی ماں کا لیکچر درمیان میں روک دیا۔ انھیں پتا تھا ٹیپ ایک بار چل پڑا تو پھر رکے گا نہیں۔ انھیں شادی کے دن اپنے ضمیر پر اپنی ماں کے لیکچر کا بوجھ لٹکانا پسند نہیں تھا۔ ''اسے لپ اسٹک نہیں لگوانی تو نہیں لگوانی۔ یہ اس کی مرضی ہے۔ شادی اس کی ہے۔ وہ جانے۔'' اماں نے فیصلہ سنایا اور فوراً کمرے سے نکل گئیں۔

''آئی لو یو نانی ماں!'' رخسار پھر سے چہک پڑی۔

شادی کے دوران کسی نے توجہ نہیں دی کہ دلہن نے لپ اسٹک نہیں لگائی، یا شاید کہنا مناسب نہ سمجھا ہو۔ کچھ کمال شادی کے جوڑے اور للی کے کیے ہوئے میک اپ کا بھی تھا۔ جوڑا روایتی گہرے سرخ رنگ کا نہیں گلابی تھا اور للی نے چہرے پر زیادہ گہرا میک اپ نہیں کیا تھا۔ اس لیے رخسار کے پتلے گلابی ہونٹ پھیکے نہیں لگے۔ چہرے پر دیر تک گھونگھٹ بھی پڑا رہا تھا۔ گھونگھٹ ہٹا تو چہرہ جھکا دیا تھا، ویڈیو اور تصویروں کے لیے چہرہ اٹھا تو روشنیوں کے جھماکے ہو رہے تھے۔ ہونٹوں پر بڑی سی نتھ بھی سایا کیے ہوئے تھی۔ لپ اسٹک نہ لگنے سے کوئی بڑا ڈرامہ نہیں ہوا۔

لیکن حجلۂ عروسی میں نجم کو ڈرامہ کرنے کا موقع مل گیا۔ دونوں ایک دوسرے کو بچپن سے جانتے تھے، جوان ہو کر محبت محبت بھی کھیلے تھے۔ شادی سے ایک دن پہلے تک انٹرنیٹ پر چٹ چیٹ کرتے رہے تھے۔ رخسار نے کمرہ بند ہوتے ہی بھاری دوپٹے اور زیوروں کا بوجھ اتار دیا تھا۔

''تم نے لپ اسٹک نہیں لگائی؟'' نجم نے اس کے چہرے کو قریب سے دیکھ کر کہا۔

''کیوں؟''

''پہلے پتا ہوتا تو بارات واپس لے جاتا۔ تمہارے ابا اپنی پگڑی میرے پاؤں پر رکھ کر اپنی

عزت کا واسطہ دیتے، پھر بھی نہ مانتا۔''

''میرے ابا پگڑی یا ٹوپی نہیں پہنتے۔ وہ تمہارا کان پکڑ کر تمہیں قاضی کے سامنے بٹھا دیتے اور تم چوں بھی نہیں بولتے۔''

''میری شادی کی خوشیاں ادھوری رہ گئیں۔ میں تمہیں معاف نہیں کروں گا۔ کبھی نہیں......''

''عقل مند! یہ ڈرامہ شادی کی پہلی رات بولنے والا نہیں ہے۔ کہاں گئی تمہاری وہ شاعری۔ تمہارے ہونٹ گلاب جیسے ہیں، وغیرہ وغیرہ۔''

نجم نے سوچا وہ صحیح کہہ رہی تھی۔ تنگ کرنے کے لیے تو ایک عمر پڑی تھی۔

ہنی مون سے واپس آتے ہی نجم نے لپ اسٹک رخسار کی چڑ بنادی۔ صبح دفتر جانے سے پہلے ڈریسنگ ٹیبل یا باتھ روم کے شیشے پر لپ اسٹک سے کچھ لکھ جاتا، یا صرف ہونٹ بنا دیتا۔ شروع میں رخسار خوب لڑی پھر اس نے چڑنا چھوڑ دیا، لیکن جب نجم نے شادی کی پہلی سال گرہ پر لپ اسٹک کا تحفہ دیا ''ہونٹوں کے نام'' تو وہ بری طرح بھڑک اٹھی۔ نجم نے اسے بہت مشکل سے منا کر اپنی شادی کی سال گرہ برباد ہونے سے بچائی تھی۔ باہر کھانا کھا کر واپس آئے تو رخسار نے وہ پرفیوم اسپرے کیا جو نجم نے تحفے میں دیا تھا اور خوشبوؤں میں تیرنے لگی۔

''کتنی اچھی خوشبو ہے، خوابوں جیسی۔ تھینک یو نجو۔''

''اور وہ جو اتنی مہنگی لپ اسٹک دی تھی، اس کا تھینک یو؟''

''یہ رکارڈ پرانا ہو گیا ہے، اسے توڑ ڈالو۔''

''جب تک نہیں بتاؤ گی تمہیں لپ اسٹک سے کیوں گھن آتی ہے، یہ رکارڈ بجتا رہے گا۔''

''تم مذاق اڑاؤ گے۔'' رخسار نے ہتھیار ڈال دیے۔

''بالکل نہیں۔ وعدہ!''

''کبھی لپ اسٹک کا نام بھی نہیں لو گے؟''

''کبھی نہیں، تمہارے سر کی قسم!'' نجم نے اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر قسم کھائی اور سنجیدہ ہو کر بیٹھ گیا۔

''اس وقت کی بات ہے جب میں آٹھ نو برس کی تھی۔'' رخسار نے سوچا شاید کہانی سنا کر اس کی

نفسیاتی گتھی سلجھ جائے۔'' ہمارے گھر کے سامنے گل خان کی دکان تھی۔ دکان کیا تھی، ایک تھڑا تھا۔ اسی کے پیچھے گل خان نے اپنے رہنے کے لیے چھوٹی سی جھونپڑی ڈال لی تھی۔ اب تو وہاں ایک بڑی کوٹھی بن گئی ہے، پہلے وہ ایک خالی پلاٹ تھا جس کا اُس وقت شاید کوئی دعوے دار نہیں تھا۔

''گل خان کی دکان پر وہ تمام چیزیں تھیں جنھیں کھانے سے اماں ہر وقت منع کیا کرتی تھیں۔ کھٹی میٹھی گولیاں، نافیاں، تل کی پٹیاں، گڑ کے لڈو، کچی املی، چنے اور جانے کیا الا بلا۔ اس کی دکان صبح سات بجے کھل جاتی جب بچے اسکول جانا شروع کرتے اور رات گئے تک کھلی رہتی۔ رات کو اس کی دکان پر محلے کے پٹھان چوکی داروں کا جرگہ ہونے لگتا۔ گرم سے گرم دوپہر میں بھی وہ دکان کھولے بیٹھا مکھیاں بھگاتا رہتا یا دکان کا سامان نئے سرے سے سجانے لگتا، اس انہماک سے جیسے دنیا میں اس سے اہم کوئی کام نہ ہو۔''

''پانی لا کر دوں۔ تمہارا گلا سوکھ گیا ہوگا۔'' نجم شاید گل خان کی کہانی سے بور ہونے لگا تھا۔

''ایک دن میں نے پہلی بار اس کی دکان بند دیکھی۔'' رخسار نے نجم کو جواب دیے بغیر کہانی جاری رکھی۔ آج وہ اس کہانی کا بوجھ سینے سے اتار پھینکنا چاہتی تھی۔ ''ہمارے چوکی دار نے بتایا وہ شادی کرنے گاؤں گیا ہے۔ گل خان تین مہینے بعد واپس آیا تو بیوی اس کے ساتھ آئی تھی۔ وہ دکان کے پیچھے بنی ہوئی جھونپڑی میں رہتی، باہر نکلتی بھی تو سر سے پیر تک مکمل پردے میں۔ صرف اماں نے اسے دیکھا تھا۔ وہ ہمارے گھر آئی تھی، اس وقت گھر میں نوکر تھے نہ بچے، اس نے اپنا چہرہ کھول دیا تھا۔ اماں دیکھتے ہی اس پر واری ہوگئی تھیں۔ ہر وقت اس کی خوبصورتی کے گُن گاتیں۔ کہتی تھیں چاند کا ٹکڑا ہے۔''

''ہم کہاں تھے!'' نجم نے ٹھیٹ فلمی عاشقوں کے انداز میں سینے پر ہاتھ مارا۔

''گھٹیا پن مت دکھاؤ۔'' رخسار نے برا سا منہ بنایا اور کہانی دوبارہ شروع کر دی۔ ''اب گل خان کی دکان ہر وقت کھلی نہ رہتی بلکہ اکثر بند رہا کرتی۔ صبح کھولتا تو دوپہر کو بند، شام کو کھولتا تو رات کو جلدی بند کر دیتا۔ محلے کے چوکی داروں کا جرگہ کہیں اور ہونے لگا تھا۔ گرمیوں کی ایک سخت دوپہر میں میرے پاس عطیہ آئی ہوئی تھی۔ وہ ہمارے پڑوس میں رہتی تھی۔ مجھ سے چار پانچ برس بڑی تھی، بارہ تیرہ سال کی۔ لیکن میری سب سے اچھی دوست وہی تھی......''

''بڑی عمر کے لوگوں سے دوستی کرنا تمہاری پرانی عادت ہے۔ آج کل تمہاری سب سے اچھی

دوست مسز صدیقی جو تمہیں فرحت ہاشمی کا درس دینے آتی ہیں، ان کے سر کے آدھے بال سفید ہیں۔''
''تم نے ان کے بال کب دیکھے؟ وہ تو ہمیشہ حجاب باندھے رہتی ہیں۔''
''ہم قیامت کی نظر رکھتے ہیں۔ شادی والی رات تمہارے بغیر لپ اسٹک والے ہونٹ کیسے پہچانے تھے؟''

''بکواس مت کرو۔'' رخسار نے کہا لیکن دل میں سوچا نجم شاید ٹھیک ہی کہہ رہا تھا۔
''عطیہ بہت چنچل اور نٹ کھٹ تھی۔'' کہانی دوبارہ شروع ہوگئی تھی۔ ''اسے جوان ہونے کی بہت جلدی تھی۔ کچی املی اس کی سب سے پسندیدہ خوراک تھی۔ اس دوپہر جب سب سو رہے تھے، ہم دبے پاؤں گھر سے نکل کر گئے لیکن گل خان کی دکان بند تھی۔ عطیہ نے کہا دکان کا تختہ بجا کر گل خان کو بلاتے ہیں۔ مجھے ڈر تھا وہ سو رہا ہوگا۔ عطیہ نے کہا جھونپڑی میں جھانک کر دیکھتے ہیں۔ سویا ہوگا تو چلے آئیں گے۔ مجھے املی سے زیادہ چاند کے ٹکڑے کو دیکھنے کا شوق تھا اس لیے دو تین بار نیم دلی سے منع کرنے کے بعد تیار ہوگئی۔ جھونپڑی میں جھانکنے کے لیے سوراخ ڈھونڈنا مشکل نہیں ہوا، لیکن اندر کا منظر دیکھ کر ہمیں سکتہ سا ہوگیا۔ دل زور زور سے دھڑک کر کہہ رہا تھا بھاگ! لیکن ہم جم کر رہ گئے تھے۔''
رخسار خاموش ہوگئی۔ نظریں نجم کے چہرے سے ہٹ کر کسی اور طرف دیکھنے لگیں، شاید وہ منظر دوبارہ آنکھوں میں سما گیا تھا۔ نجم نے بھی ٹوکنا مناسب نہیں سمجھا۔ اسے پتا تھا کہانی کی 'پنچ لائن' اب آنے ہی والی ہے۔
''گل خان کی بیوی واقعی چاند کا ٹکڑا تھی۔'' رخسار نے اسی طرح خلا میں تکتے ہوئے کہا ''لیکن اس وقت چاند کے بدن پر چڑ چڑاتی بڑھیا کا سایہ تک نہیں تھا اور گل خان بہت انہماک سے ہونٹوں پر لپ اسٹک لگا رہا تھا، اسی انہماک سے جس سے وہ دکان کے تختے پر مٹھائیاں سجایا کرتا تھا۔''
''وہ اپنی بیوی کو کپڑے پہنا رہا تھا۔'' نجم نے قہقہہ لگایا۔ ''لیکن اس میں گھن کھانے کی کیا بات تھی۔'' اسے کہانی کا انجام سن کر مایوسی ہوئی تھی۔
''بے وقوف! وہ لپ اسٹک اپنی بیوی کے ہونٹوں پر نہیں اپنے ہونٹوں پر لگا رہا تھا۔''
''نجم کی سمجھ میں ایک لمحے کے لیے کچھ نہیں آیا۔ بس وہ اپنے خشک ہونٹوں پر زبان پھیرنے لگا۔ رخسار اسے حیرت سے دیکھتی ہوئی سوچ رہی تھی ''نجو کو گھن کیوں نہیں آئی؟''

بدلتے زمانے

''میں یہ افسانہ شائع نہیں کرسکتا۔'' کاظمی صاحب نے اطہر نوید کے سر پر جیسے ہتھوڑا مار دیا۔ اطہر کا خیال تھا کاظمی صاحب شاباش دیں گے، افسانے کی تعریف کریں گے۔ وہ نئے ادیبوں کی حوصلہ افزائی کرنے کے لیے مشہور تھے۔ ان کی ''ہاں'' دنیائے ادب میں داخلے کی چابی بن سکتی تھی۔ لیکن انہوں نے تو افسانہ اس کے منہ پر دے مارا تھا۔ اطہر نوید کو لگا اس کا افسانہ نگاری کا کیریئر شروع ہونے سے پہلے ہی ختم ہو گیا ہو۔ ادب کی سند لینے کے لیے ان کے رسالے میں چھپنا ضروری تھا۔ افسانہ، شاعری، تنقید اور ہر ادبی اسکول کی ہیڈ ماسٹری کاظمی صاحب کے پاس تھی۔ جو انہیں پسند نہیں کرتے تھے وہ بھی ڈرتے تھے۔ کاظمی صاحب خود پر تنقید کرنے والوں کا حقہ پانی بند کر سکتے تھے۔ خود کچھ نہ کہتے لیکن ان کے چیلے لٹھ لے کر دوڑ پڑتے۔ اس لیے اطہر نوید بھی چوں کیے بغیر بیٹھا رہا۔

''لیکن کیوں؟'' اس نے بڑی مشکل سے تھوک نگل کر پوچھا۔

''دیکھیے، میں فحاشی نہیں چھاپتا۔'' کاظمی صاحب نے اپنی گھنی بھنویں سکیڑ کر کہا۔

''فحاشی؟''

''جی ہاں! آپ نے اچھی شروعات کی تھی۔ افسانے کی اٹھان بھی اچھی تھی، بلکہ بے حد اچھی، لیکن آپ نے آخر میں کیا کیا؟''

''او ہنری کا فارمولا۔ چونکانے والا اختتام۔''

''آپ کیا او ہنری ہیں؟''

''دیکھیے منٹو نے بھی...... بلکہ آپ تو منٹو کے دفاع میں سب سے آگے تھے۔''

''تو آپ منٹو بننا چاہتے ہیں۔''

''نہیں مگر......''

''اطہر میاں! زمانہ بدل گیا ہے۔ وہ زمانہ اور تھا یہ زمانہ اور ہے۔ میں فحاشی نہیں چھاپ سکتا۔ امید ہے آپ برا نہیں مانیں گے۔'' کاظمی صاحب نے بات ختم کر دی اور چشمہ لگا کر میز پر رکھا ہوا ایک اور مسودہ دیکھنے لگے۔

''آپ نے خود بھی لکھا ہے۔ آپ کا وہ افسانہ جس میں......'' اطہر نوید نے دیکھا کاظمی صاحب نے سر تک نہیں اٹھایا، جیسے سن نہیں رہے ہوں۔ اس نے جملہ ادھورا چھوڑا اور اپنے افسانے کا مسودہ لے کر تھکے تھکے قدموں سے واپس چلا گیا۔

اس کے جانے کے بعد کاظمی صاحب نے چشمہ اتارا اور سر کرسی کی پشت سے ٹکا دیا۔ ''آپ کا وہ افسانہ جس میں......'' اطہر نوید کا ادھورا جملہ کانوں میں گونجا تو انہوں نے برابر کے شیلف سے جس میں ان کی درجن بھر کتابوں کے کئی درجن ایڈیشن ترتیب سے لگے تھے، ایک کتاب نکالی۔ یہ ان کے افسانوں کا ایک پرانا مجموعہ تھا۔ کاظمی صاحب اچھی طرح جانتے تھے یہ لونڈا کس افسانے کی بات کر رہا تھا۔ وہ اس افسانے کی ورق گردانی کرنے لگے۔ آخری صفحے پر پہنچے تو کتاب بند کر دی۔

''یہ سب کچھ میں نے کیسے لکھا۔ مجھے معاف کر خداوند۔ میں اُس وقت گمراہ تھا۔ مجھے معاف کر......'' ان کا سر ایک بار پھر کرسی سے ٹک گیا۔ بے چینی بڑھ گئی تھی۔ الماری سے اپنا نیا شعری مجموعہ نکال کر دیر تک اس میں شامل نعتیں گنگناتے رہے۔ پھر بھی قرار نہیں آیا تو ریسیور اٹھا کر راحت انبالوی کے نمبر ڈائل کرنے لگے۔ راحت انبالوی ان کا ٹریول ایجنٹ دوست تھا جس کا کلام ان کے رسالے میں پابندی کے شائع ہوتا تھا۔

''راحت صاحب عمرے کے لیے ویزے اور ٹکٹ کا بندوبست کیجیے۔ باقی بندوبست جدہ میں وحید انصاری کر دیں گے۔''

''اچانک؟'' دوسری طرف سے راحت انبالوی کی آواز آئی۔

''کچھ پرانے گناہ معاف کروانے ہیں۔''

فون بند کر کے کاظمی صاحب نے بے دلی سے دو ایک مسودے دیکھے، پھر لوگوں کے آنے کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ ملنا نہیں چاہتے تھے لیکن باہر سے آئے ہوئے مہمانوں کو منع بھی نہیں کر سکتے تھے۔ وہ ادیبوں کا داتا دربار تھے۔ کوئی ادیب دوسرے شہر یا ملک سے آئے اور کاظمی صاحب کی زیارت نہ کرے؟ اب تو کاظمی صاحب کو بھی عادت ہو گئی تھی۔ کوئی ملے بغیر چلا جائے تو برا مانتے تھے۔

گھر پہنچے تو دیر ہو گئی تھی۔ ان کا بیٹا ان کے بارہ سالہ پوتے انور کے کان کھینچ رہا تھا اور اس سے دو سال چھوٹا گڈو دور کھڑا خوش ہو رہا تھا۔

''کیا ہوا، کیا کیا اس نے؟'' کاظمی صاحب پوتے کی مدد کو آئے۔

''ہر وقت کمپیوٹر پر رہتا ہے، اور وہ بھی انٹرنیٹ پر۔ نہ کوئی فون آ سکتا ہے نہ کوئی کر سکتا ہے۔''

''کمپیوٹر کی مہارت تو اچھی بات ہے۔ اور وہ بھی اس عمر میں۔ تمہیں خوش ہونا چاہیے۔''

''خوش؟ میں پریشان ہوں۔ آپ نہیں جانتے اس چھوٹے سے شیطانی ڈبے میں کیا کیا بھرا ہے۔''

''ہر نئی چیز علم میں اضافہ کرتی ہے۔ کمپیوٹر کے دور کا یہی کمال ہے۔ یہ دنیا انور کی عمر میں میری اور تمہاری دسترس میں نہیں تھی۔''

''اس عمر میں آپ نے مجھے اپنے افسانے تک نہیں پڑھنے دیے تھے۔''

''اب زمانہ بدل گیا ہے۔ اب زمانہ بدل گیا ہے۔'' کاظمی صاحب بڑبڑاتے ہوئے اپنے کمرے میں چلے گئے۔ کچھ دیر آرام کر کے تازہ دم ہوئے تو بہو ان کا پرہیزی کھانا لے آئی۔ کھانا کھا کر نماز پڑھی اور صحن میں ٹہلتے رہے۔ چھوٹی سی کیاری میں رات کی رانی اور موتیا کے پودے لگے تھے۔ نزدیک جا کر سونگھا تو کھوئی ہوئی کوئی خوشبو بدن کی سیر کرتی ہوئی روح میں اتر گئی۔

''خوشبو کبھی بوڑھی نہیں ہوتی، نہ ہونے دیتی ہے۔'' انہوں نے مسکرا کر سوچا۔

کمرے میں آئے تو ایک نیا ادبی رسالہ پڑھنے لگے جو اسی روز ڈاک سے آیا تھا۔

''ہر نتھو خیرا ایڈیٹر پبلشر بن کر اپنی انا کے اشتہار بانٹ رہا ہے۔'' انہوں نے رسالے کے

اوراق پلٹتے ہوئے سوچا۔ ''بے سُری غزلیں، بے تکے افسانے، پتھر کے زمانے کی تنقیدیں۔'' انہوں نے بیزار ہوکر رسالہ میز پر پھینک دیا۔

''سب خود کو اور ایک دوسرے کو دہرا رہے ہیں۔ افسانہ لکھنے والی بیبیاں ابھی تک آنگنوں اور باغیچوں میں آنکھ مچولی کھیلتے ہوئے عشق کر رہی ہیں۔ کسی کو پتا نہیں کہ زمانہ بدل گیا ہے۔ بارہ سالہ بچہ کمپیوٹر پر پوری دنیا مٹھی میں لیے بیٹھا ہے۔'' ان کی سوچیں اسی طرح بڑبڑاتی رہیں۔

انہوں نے انگڑائی لے کر ٹانگیں میز پر پھیلا دیں اور دونوں ہاتھ سر کے پیچھے باندھ لیے۔ یہ آمد کا وقت تھا۔

''مجھے اب شاعری چھوڑ دینا چاہیے۔'' سوچیں پھر بڑبڑائیں۔ ''یہ تنگ بندوں کا زمانہ ہے۔ کسی کے پاس خیال کی گہرائی میں اترنے کی صلاحیت ہے نہ وقت۔'' انہوں نے سر جھٹکا، لیکن پھر کہیں سے ایک مصرعہ آ کر دماغ میں رینگنے لگا۔ ''فاعلاتن فاعلاتن فاعلا...... ''بھیں بھیں کرتے ہوئے گڈو نے کمرے میں آ کر ان کی سوچوں میں بریک لگا دیا۔ وہ اسے سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگے۔

''دادا! بھائی مجھے کمپیوٹر پر نہیں کھیلنے دیتا۔ کہتا ہے میں ابھی چھوٹا ہوں۔''

''وہ صحیح کہتا ہے۔ ذرا بڑے ہو جاؤ تو میں تمہیں اس سے اچھا کمپیوٹر خرید کر دوں گا۔'' انہوں نے اپنے چہیتے کو بہلایا۔

''لیکن بھائی بھی تو چھوٹا ہے۔'' گڈو نے رونا بند کر کے کہا۔

''ٹھیک ہے، ٹھیک ہے، میں اسے ڈانٹوں گا۔ تمہارے امّی ابّو کہاں ہیں۔''

''اپنے کمرے میں، وہ سو رہے ہیں۔''

''تم یہاں میرے بستر پر سو جاؤ۔'' گڈو خاموشی سے ان کے پلنگ پر لیٹ گیا۔ کاظمی صاحب نے اسے رضائی اڑھائی اور بستر کے کنارے پر ٹک کر اسے آہستہ آہستہ تھپکنے لگے۔ گڈو کو سونے میں دیر نہیں لگی۔ کاظمی صاحب اسے بہت پیار سے دیکھتے ہوئے سوچ رہے تھے یہ چھوٹے چھوٹے پھول نہ ہوتے تو زندگی کتنی بے رنگ اور خالی خالی لگتی۔

وہ انور کی خبر لینے صحن عبور کر کے بچوں کے کمرے کی طرف گئے جہاں کمپیوٹر بھی لگا تھا۔ انور کی آنکھیں کمپیوٹر پر گڑی تھیں اور محویت کا یہ عالم تھا کہ اسے کاظمی صاحب کے آنے کی خبر تک نہیں ہوئی۔

کاظمی صاحب نزدیک پہنچے تو اسکرین پر آتے جاتے منظر دیکھ کر سکتے میں رہ گئے۔ اسکرین پر چکا چوند ہو رہی تھی۔ ہر رنگ اور حجم کی بے لباس حسینائیں ایک ایک کر کے آ جا رہی تھیں۔ ان کے کرتب دیکھ کر کاظمی صاحب اندر ہی اندر کپکپانے لگے۔ انہوں نے اپنی اسی سالہ زندگی میں کسی عورت کو، اپنی بیوی تک کو، اس طرح بے لباس نہیں دیکھا تھا۔ اور یہ بارہ سالہ بچہ! زمانہ واقعی بہت بدل گیا ہے، انہوں نے سوچا۔

وہ بے آواز قدموں سے اپنے کمرے میں واپس آئے۔ گڈو بے خبر سو رہا تھا۔ کاظمی صاحب نے اپنے اعصاب بحال کیے، کھنکارتے اور انور کو پکارتے ہوئے دوبارہ اس کے کمرے کی طرف جانے لگے۔ انور نے ''جی دادا!'' کہہ کر'' کی بورڈ'' پر انگلیاں ماریں اور کمپیوٹر بند کر دیا۔ کاظمی صاحب اس کے کمرے میں پہنچے تو کمپیوٹر کی اسکرین تاریک اور انور کا چہرہ سفید تھا۔

''گڈو میرے کمرے میں سو گیا ہے، تم بھی وہیں آ جاؤ۔'' انور خاموشی سے چلتا ہوا ان کے ساتھ کمرے میں آ گیا۔ کاظمی صاحب کی محبت جوش مارتی تھی تو وہ پوتوں کو اپنے بستر پر سلا لیتے تھے۔ انور کو عادت تھی وہ گڈو کے ساتھ لیٹ گیا اور تھوڑی ہی دیر میں بے خبر ہو کر سو گیا۔ کاظمی صاحب کے لیے آج جاگنے کی رات تھی۔ وہ دیر تک راکنگ چیئر پر جھولتے رہے۔

صبح جب بیٹا انہیں دفتر چھوڑنے جا رہا تھا تو انہوں نے اسے اپنا فیصلہ سنایا۔

''تم ٹھیک کہتے تھے۔ انور کو ابھی کمپیوٹر پر اس طرح بے لگام چھوڑنا ٹھیک نہیں ہے۔ نگرانی ضروری ہے۔ تم کمپیوٹر میرے کمرے میں منتقل کر دو۔ میں نگاہ رکھوں گا۔''

''آپ فکر نہ کریں۔ میں نے اپنے دفتر میں کمپیوٹر سیکشن کے ایک دوست سے بات کی ہے۔ وہ ان تمام سائٹس پر فائر وال لگا دے گا جو بچوں کو نہیں دیکھنا چاہئیں۔''

''پھر بھی نگرانی ضروری ہے۔''

''جی ابا جی! جیسا آپ کہیں۔'' فرماں بردار بیٹے نے گاڑی کا گیئر بدلتے ہوئے بات ختم کر دی۔

کاظمی صاحب دفتر پہنچے تو راحت انبالوی عمرے کے فارم لیے بیٹھا ان کا انتظار کر رہا تھا۔

''راحت صاحب! میں نے ارادہ بدل دیا ہے۔'' انہوں نے فارم واپس کرتے ہوئے کہا۔

راحت انبالوی کو حیرت ہوئی لیکن اس نے کچھ کہا نہیں۔ وہ کافی پی کر، ان شاعروں کی برائیاں کر کے جنہیں کاظمی صاحب پسند نہیں کرتے تھے اور اپنی نئی غزلیں رسالے میں چھپنے کے لیے دے کر چلا گیا۔ کاظمی صاحب نے وہ کارڈ تلاش کیا جو کل اطہر نوید دے کر گیا تھا اور اس پر لکھا فون نمبر ڈائل کرنے لگے۔

''اطہر میاں! اپنا افسانہ دے جاؤ، میں اسے دوبارہ دیکھوں گا۔''

''لیکن آپ نے تو اسے فحش کہا تھا!'' اطہر نوید کو فون کال پر یقین نہیں آیا تھا۔

''زمانہ بدل گیا ہے۔ دنیا بھر کی فحاشی بارہ سال کے بچے کی انگلیوں پر ناچتی ہے۔ میرا رسالہ تو چالیس، پچاس یا اس سے بھی زیادہ عمر کے لوگ پڑھتے ہیں۔'' انہوں نے فون بند کر کے اپنی ایک پرانی کتاب نکالی اور ایک پرانا افسانہ پڑھ کر دل ہی دل میں مسکرانے لگے۔

ایک کہانی غربت کی

''بڑے لوگوں کے درمیان بیٹھے ہو بھائی راشد! میرؔ، سوداؔ، دردؔ، غالبؔ، مصحفیؔ، خیریت تو ہے؟''

''نشہ دو آتشہ کر رہا ہوں۔''

''نشے کے لیے صرف شاعری کا اعلیٰ ہونا کافی نہیں، شراب کا گھٹیا ہونا بھی ضروری ہے۔ پندرہ سال پرانی گرین لیبل پیو گے تو وہ صرف لوری سنائے گی۔ جوانی یاد کرو جب تم نے بھی جم خانے کا پوا پی کر دیوداس کے گانے گائے ہوں گے۔''

''مت یاد دلاؤ، مت یاد دلاؤ۔''

''کچھ ڈاؤن ڈاؤن لگتے ہو۔ آج کل کچھ لکھ بھی نہیں رہے۔ لکھا ہو تو سنایا نہیں۔''

''سنانے کو کچھ نہیں ہے بیگ صاحب! بس اب اپنی بالکونی سے سمندر دیکھتا اور لہریں گنتا ہوں۔ سمندر کی ریاضی دل و دماغ کے دو اور دو چار ٹھیک کر دیتی ہے۔''

''لیکن تم تو بالکونی اور کھڑکیوں کے پردے بھی بند کیے بیٹھے ہو۔ لگتا ہے آج سمندر سے بھی ناراض ہو۔''

''سمندر سے تاک جھانک میں شاعری کا رومانس غرق ہو رہا تھا۔''

''اتنے تلخ ہورہے، رومانس پاس نہیں پھٹکے گا۔ شاعری بھی صرف ڈنک مارے گی۔ پہلے اپنے اندر مٹھاس گھولو۔ شاعری مٹھاس مانگتی ہے۔''

''مٹھاس ذیابیطس والوں کے پاس ملے گی۔ میرے پاس صرف کڑواہٹ بچی ہے۔''

''تو پھر شاعری کو معاف کرواور اپنی تلخیوں کا زہر پی کر خاموشی سے اللہ کو پیارے ہوجاؤ۔''

''بیگ صاحب! کھال بہت موٹی ہوگئی ہے۔ کسی زہر کا اثر نہیں ہوتا۔ لکھنا پڑھنا سب بے کار اور الفاظ بے معنی لگتے ہیں۔ اب صرف بھونپو بجانے کا رواج ہے۔ بھونپو بجاؤ یا بھونپو بجانے والوں کے پیچھے لگ جاؤ۔''

''ہاہاہا! گہری چوٹ معلوم ہوتی ہے۔ تم پچھلے ہفتے پاکستان میں تھے، وہاں کچھ ہوا ہے؟''

''کچھ کرنا چاہتا تھا لیکن ہوا نہیں۔ کچھ کیے بغیر ہی سڈنی واپس آ گیا۔''

''کیوں؟''

''سوچا تھا کچھ لکھاریوں کو جمع کروں گا، اپنی نئی کتاب پر تبصرے سنوں گا، غلطی سے پہلا فون تمہاری پسندیدہ دانش ورکو کردیا۔''

''یہ غلطی نہیں بے وقوفی تھی۔ الیاس اختر سے کہتے۔ وہ اس اخبار کا ایڈیٹر ہے جس میں وہ کالم لکھتی ہے۔ گھٹنوں کے بل چل کر آتی۔''

''ہاں شاید! لیکن مجھے اپنے بارے میں بھی کچھ غلط فہمی تھی، وہ دور ہوگئی۔''

''اس نے کہا کیا؟''

''کہنے لگی وہ اپنے ڈیفنس کے نئے اپارٹمنٹ میں شفٹ ہورہی ہے، سخت مصروف ہے اور تھک بھی گئی ہے۔ میں نے کہا شفٹنگ مکمل ہونے کے بعد، کہنے لگی اسے جرمنی جانا اور غربت ہٹاؤ سیمینار میں پیپر پڑھنا ہے۔ میں نے کہا واپس آ جاؤ تو...... کہنے لگی غریبوں کا حال دیکھ دیکھ کر بے حال ہوگئی ہے، ڈپریشن کے دورے پڑنے لگے ہیں۔ میونخ سے سیدھی لندن جائے گی، آرام کرے گی اور ماہرین سے اپنے دماغ کی مالش کرائے گی۔ میں نے کہا لندن میں میرا فلیٹ آج کل خالی ہے چاہو تو...... کہنے لگی نواحی علاقے میں ہوگا، انڈرگراؤنڈ میں دھکے کھانے پڑیں گے۔ اس کے کالموں کے ایک پرستار نے کینسنگٹن میں ایک سروس اپارٹمنٹ کا انتظام کردیا ہے۔ بکنگھم پیلس بھی نزدیک ہے، آتے جاتے

ہوئے شہزادوں کو دیکھ سکے گی۔''

''ہاہاہا! یہیں مار کھا گئی۔اسے تمہارے اپارٹمنٹ کا جغرافیہ معلوم نہیں ہے۔''

''آگے سنو۔ کہنے لگی میں غریبوں کے لیے نہیں لکھتا صرف امیروں کے پیچھے بھاگتا ہوں۔ جس دن غریبوں پر لکھوں گا اس دن میرے جلسے میں بغیر بلائے چلی آئے گی۔''

''بھائی راشد! اس میں برا ماننے کی کیا بات ہے۔لکھ دو ایک کہانی غربت کی۔تم تو سند یافتہ ہو۔ پارٹی پارٹی بھی کھیل چکے ہو۔''

''مجھے یہ سند غریبوں کی کہانیاں لکھنے کے لیے نہیں، غربت پیدا کرنے والے نظام کے خلاف لڑنے کے لیے ملی تھی۔''

''واہ! انقلاب زندہ باد!''

''مذاق مت اڑاؤ۔''

''مذاق نہیں جوش دلا رہا تھا۔تم خواہ مخواہ چڑ رہے ہو۔غربت پر لکھی جانے والی کہانیاں طبقاتی شعور اجاگر کرتی ہیں۔ کتنے بڑے بڑے افسانہ نگار تھے جنہوں نے غربت کے خلاف قلم سے جہاد کیا۔''

''پھر کیا ہوا؟ غریبوں کی کہانیاں لکھنے والوں نے صرف اپنی غربت دور کی۔ وہ خود چھوٹی سے بڑی بستی میں چلے گئے۔ان کے بچے انگریزی اسکولوں میں یا باہر جا کر پڑھنے لگے۔غریب اور زیادہ غریب ہو گیا۔طبقاتی شعور اجاگر کرنے والوں نے وہ چادر بھی اتار لی جس سے غربت اپنی پردہ پوشی کرتی تھی۔وہ غربت کو ننگا کر کے اس سے اپنی ہوس مٹاتے رہے۔''

''تم زیادتی کر رہے ہو۔کج بحثی۔کیا تخلیق کاروں کو اچھی زندگی گزارنے کا حق نہیں۔''

''ہے! لیکن غربت کا بلادکار کر کے نہیں۔''

''راشد! تم اتنے Negative کیوں ہو گئے ہو؟''

''عمر اور تنہائی بیگ صاحب! برداشت کی سطح زیرو پر آ گئی ہے۔''

''نہیں! تم بس ضدی ہو گئے ہو۔لکھو ایک کہانی غربت کی اور بڑے منہ والوں کے منہ پر دے مارو۔''

''فائدہ کیا ہوگا؟''

''تکمیلِ فن، تمہاری تحریروں میں آنے والی موضوعاتی ہمہ جہتی، وغیرہ وغیرہ۔''

''اتنا مشکل مت بولو۔ تمہیں پتا ہے میں کہانی گڑھتا نہیں ہوں، ڈھونڈتا ہوں۔''

''دیس دیس گھومتے ہو، غربت کی ایک کہانی نہیں ملی؟''

''بہت ملتی ہیں، لیکن غربت کی سب کہانیاں ایک جیسی ہوتی ہیں۔ ان میں کوئی نیا پن نہیں ہوتا۔ سب غریب ایک طرح کے غموں کی زنجیر میں بندھے ہیں۔''

''تمہاری وہ آگ کیا ہوئی جو زنجیریں پگھلاتی تھی؟''

''اب کہاں! اب کہاں! ایک آدھ چنگاری کہیں دبی پڑی ہے۔ سلگانے کی کوشش کرتا ہوں تو بھڑک اٹھتی ہے۔ آگ بھڑکتی ہے تو لکھنے کو نہیں انقلاب لانے کو جی مچلتا ہے۔''

''انقلاب بھول جاؤ۔ اپنے دیس میں اب انقلاب کی آگ نہیں بھڑکتی، اگربتیاں سلگتی ہیں یا لوبان دھواں دیتا ہے۔''

''ہاں مگر یہ ایک دیس کا نہیں دیس دیس کا قصہ ہے۔ میں کچھ دن پہلے دبئی گیا تھا۔ دن بھر کی کاروباری ملاقاتوں سے تھک کر ہوٹل کے بار میں گیا تو ایک ایتھوپین لڑکی نے مجھے شکار کرلیا......''

''ایتھوپیا! غربت کا استعارہ! واہ! کیا کہانی نکلی ہوگی۔''

''وہ میرے ساتھ کمرے میں آنے کی ضد کرنے لگی۔ مجھے غربت خریدنا پسند نہیں ہے۔ ضمیر پر پہلے ہی بہت بوجھ ہیں۔ غربت کا سودا کر کے بوجھ بڑھانا نہیں چاہتا تھا، لیکن اس نے ضد کر کے کمرے کا نمبر لے لیا اور میرے پہنچنے کے کچھ دیر بعد وہ بھی کمرے میں تھی۔''

''یہ غربت کی کہانی ہے یا ہے کاماسترا؟''

''وہ بہت پُرکشش تھی۔ سیاہ رنگت میں اجالا چمک رہا تھا اور ہنستی تو لگتا تھا غریب کی جھونپڑی میں موتی بکھر گئے ہوں۔ وہ قریب آئی اور کچھ کہے بغیر میری بانہوں میں سما گئی، اور بس یہیں ساری گڑبڑ ہوگئی۔''

''گڑبڑ تو ہونا ہی تھی۔''

''دنیا بھر کی غربت میری گود میں بھر گئی تھی۔ میری بانہوں میں ایک کھوکھلا وجود تھا۔ ایک قحط زدہ ڈھانچہ۔ مجھے اس کے بدن کا گداز نہیں پسلیاں چبھ رہی تھیں۔ افریقی قحط کی دستاویزی فلموں میں جو

ڈھانچے دیکھے تھے وہ مجھ سے لپٹ گئے تھے۔ میں گھبرا کر اس سے الگ ہوا اور دور جا کر بیٹھ گیا۔ وہ اسی طرح کھڑی مجھے حیرت سے دیکھتی رہی۔ میں نے اسے پیسے دے کر رخصت کیا تو مجھے ترس کھاتی نظروں سے دیکھ کر چلی گئی۔''

''کہانی دیے بغیر؟''

''وہ کہانی نہیں جسم بیچنے آئی تھی۔ غربت جسم بیچ دیتی ہے، اپنی انا نہیں بیچتی۔''

''دل چھوٹا مت کرو۔ اور مل جائیں گی۔ پاکستان جاؤ گے تو وہاں بھی جگہ جگہ ایتھوپیا بکھرے ہوئے ہیں۔''

''ہاں شاید! ایک کہانی ہے بھی جو بار بار سر اٹھاتی ہے لیکن میں چپت مار کر بٹھا دیتا ہوں۔''

''سناؤ! مجھے پتا ہے تم کہانی اپنے دماغ میں لکھ لیتے ہو، بعد میں کاغذ پر اتارتے ہو۔''

''یہ کہانی ابھی غوں غاں کرتی ہوئی گھٹنوں کے بل چل رہی ہے۔ اپنے پاؤں پر کھڑی ہو جائے تو......''

''مجھے غوں غاں کرتی کہانی سننا ہی پسند ہے۔ بلوغت کو پہنچے گی تو کیل مہاسے چھپانے کے لیے چہرے پر میک اپ تھوپ لے گی۔''

''پہلے ڈرنک بناؤ، گلاس خالی ہو گئے ہیں۔ نہیں اس بوتل سے نہیں۔ یہ لو! اسے کھولو۔ میں غربت کی کہانی سنتے اور سناتے وقت سب سے مہنگی شراب پیتا ہوں۔''

''یہ تو نئی چیز ہے!''

''نئی نہیں، پچاس سال پرانی سنگل مالٹ ہے۔ اسکاٹ لینڈ میں ایک وائنری (Winery) سے خریدی تھی۔''

''بہت مہنگی ہو گی؟''

''پیو کہ مفت لگا دی ہے خونِ دل کی کشید!''

''پھر بھی!''

''قیمت بتاؤں گا تو تمہارے حلق سے نہیں اترے گی۔ Raise the drink۔''

''چیئرز! تو پھر کیا ہوا؟''

''کہاں کیا ہوا؟''

''وہ تمہاری غربت کی کہانی۔''

''ہاں وہ! وہ ایک ہجرت زدہ غریب خاندان کی کہانی ہے۔ ایک ہیرو ہے لیکن ولن کوئی نہیں۔ بس حالات، وقت کی گردش......''

''یہی سب سے بڑے ولن ہیں۔''

''میاں صاحب درمیانے درجے کے زمین دار تھے۔ وہ ہندوستان سے کسی لٹے پٹے مہاجر کی طرح نہیں بلکہ کافی دولت لے کر پاکستان آئے تھے۔ وہ ایک سیدھے سادے انسان تھے اور پیسہ کمانے کا ہنر نہیں جانتے تھے، نئے دیس اور نو دولتیوں کے ہجوم میں پس کر رہ گئے۔ ہوش اس وقت آیا جب خزانہ خالی ہو گیا اور بچوں کی تعداد پانچ تک پہنچ گئی۔ جن رشتے داروں کے ساتھ رہ رہے تھے ان کے خاندان بھی بڑے اور مکان تنگ ہونے لگے تھے۔ سر پر صرف آسمان کی چھت رہ گئی تو دور کے ایک کھاتے پیتے مہربان رشتے دار نے مدد کی اور جس کمپاؤنڈ میں وہ رہتے تھے اس میں اپنے فلیٹ کے ساتھ میاں صاحب کو ایک جھونپڑی ڈلوادی۔ یہ تم جماہی کیوں لے رہے ہو؟''

''تمہاری شروعات بور کر رہی ہے۔ وہی پرانا قصہ، کہانی کہاں ہے؟''

''کچھ کہانیاں ایسی بھی ہوتی ہیں جن میں کہانی نہیں صرف واقعات ہوتے ہیں۔ میں نے تم سے پہلے بھی کہا تھا، غربت کی سب کہانیاں ایک جیسی ہوتی ہیں۔ سناؤں یا ختم کروں؟''

''نہیں نہیں! سناؤ۔ مجھے پتا ہے تم آگے جا کر کوئی نیا موڑ نکالو گے۔''

''میاں صاحب کا نیا گھر کاغذ کی چہار دیواری تھی۔ چٹائیوں کی دیواریں اور ٹاٹ کا دروازہ۔ تیز ہوا چلتی تو تنکوں کی بنی ہوئی دیواروں میں زلزلہ آجاتا۔ میاں صاحب اپنی غربت کا پردہ قائم رکھنے کے لیے سُتلی لے کر چٹائیاں بانس کے ساتھ باندھنے میں جُت جاتے۔ بچوں کو بھی عادت ہو گئی تھی۔ جھکڑ چلتے ہی بچے چٹائیوں سے لپٹ جاتے اور دیوار کا سہارا بن کر کھڑے رہتے۔ جھونپڑی کا ڈھانچہ ٹین کا بوجھ نہیں اٹھا سکتا تھا اس لیے سرکنڈے کی چھت ڈالی تھی اور اوپر سے ایک پرانی ترپال۔ لیکن یہ دوہری تہہ بھی دھوپ اور بارش روکنے میں ناکام تھی۔ گھر میں بان کی بنی ہوئی چند چارپائیاں تھیں۔ صبح ہوتے ہی بی بی جان سب بستر لپیٹ دیتیں، صرف ایک پلنگ پر ایک موٹی سی دری بچھی رہتی۔ یہ بی بی

جان کے جہیز کی دری تھی جو امارت سے غربت تک کے ہر سفر میں ساتھ رہی تھی۔

''چھم چھم کرتی بارش جب سرکنڈوں اور ترپال کی دفاعی لائن توڑ کر سروں پر ٹپکتی تو میاں صاحب، بی بی جان اور پانچوں بچے چار پائی پر آ بیٹھتے اور ایک دوسرے کے سر میں سر ڈال کر اوپر سے دری اوڑھ لیتے۔ دری ٹپکتی ہوئی چھت کا چھڑکاؤ اپنے اندر جذب کر لیتی۔ ایک بارش میں دری کی جذب کی ہوئی نمی میاں صاحب کے سب سے پیارے بچے کے دماغ تک پہنچ گئی۔ بی بی جان نے سب گھریلو ٹوٹکے آزما لیے لیکن اس کا بخار نہیں اترا۔ وہ رات بھر اس کے ماتھے پر ٹھنڈے پانی کی پٹیاں بدلتیں لیکن آنکھوں سے ٹپکتے گرم آنسو بخار کی حدت اور بڑھا دیتے۔ نیم بے ہوشی جب مکمل بے ہوشی میں بدل گئی تو ڈاکٹر کے پاس دوڑے۔ ڈاکٹر مہربان تھا، اس نے فیس کا مطالبہ نہیں کیا لیکن دوا بھی نہیں دی اور نسخے میں دعا کی ہدایت لکھ کر رخصت کر دیا۔ غریبوں کی دعائیں قبول ہو سکتیں تو وہ محلوں میں رہتے اور من و سلویٰ کھاتے۔ پھول سا بچہ اسی رات موت کی آغوش میں سو گیا۔ میاں صاحب کے دل کا ایک ٹکڑا کٹ گیا اور وہ اندر سے اور کھوکھلے ہو گئے۔

''میاں صاحب کے اندر ٹوٹ پھوٹ پہلے سے بہت تھی۔ ان کی انا روز ٹوٹتی تھی اور وہ اسے بھی چٹائی کی دیوار کی طرح ٹانکے لگا لگا کر جوڑ لیتے۔ کمپاؤنڈ میں رہنے والے اکثر فاتحہ کا کھانا اپنے غریب ہمسائے کو بھیجتے تو میاں صاحب لینے سے منع کرنے کی بدتمیزی تو نہیں کر پاتے لیکن کھانے کی ٹرے نزدیکی غریب بستی کے کسی گھر میں دے آتے۔ بی بی جان خالی برتنوں کو دھو کر مہربان خاندان کو واپس بھجوا دیتیں۔ بچے فاتحہ کے قورمے، بریانی کی خوشبو تک سے محروم رہتے۔ ان کے لیے بی بی جان کے بنائے ہوئے کھانے من و سلویٰ سے زیادہ مزے دار تھے۔ بی بی جان پانی میں املی گھول کر اور نمک مرچ ملا کر جب سوکھی روٹی سے انھیں کھلاتیں یا مسالے میں باسی روٹی کے سوکھے ٹکڑے پکاتیں تو بچوں کے منہ میں لذتوں کے ذائقے گھل جاتے۔ میاں صاحب کمپاؤنڈ میں رہنے والے بچوں کو اُردو اور بی بی جان قرآن پڑھا کر پانچ روپے فی بچہ کی جو اُجرت پاتے تھے اس میں اسی طرح کے پکوان ممکن تھے۔

''بیٹے کی موت نے میاں صاحب کی طرح بی بی جان کو کھوکھلا نہیں کیا تھا، بلکہ وہ اندر سے اور مضبوط ہو گئی تھیں۔ وہ جانتی تھیں کہ بچے تعلیم کی سیڑھیاں چڑھ کر ہی غربت سے واپسی کا سفر طے کر سکتے

تھے۔ بچے محلے کے سرکاری اسکول میں داخل تو ہو گئے تھے لیکن بی بی جان کو پتا تھا کہ ٹوٹے پھوٹے کمروں کی گرد آلود دریوں پر بیٹھ کر الف بے کا سبق یاد کرنے سے ان کا مستقبل نہیں بنے گا۔ ایک دن وہ اپنے بڑے بیٹے علی اکبر کو قریب کے اس انگریزی اسکول میں لے گئیں جہاں کمپاؤنڈ میں رہنے والے خوش حال خاندانوں کے بچے پڑھتے تھے۔ اسکول چلانے والی خدا ترس راہبہ شہر میں پھیلی ہوئی غربت کے تماشے دیکھ دیکھ کر اور یسوع مسیح کو یاد کرتے کرتے تھک گئی تھی۔ ایک بچے کو مفت تعلیم دینے کی حامی بھر کے اس نے اپنے ضمیر کا بوجھ ہلکا کرنے کی کوشش کی۔ راہبہ کو یہ بھی اطمینان تھا کہ علی اکبر شکل سے غریب نہیں لگتا تھا اور اسکول کے دوسرے بچوں میں کھپ سکتا تھا۔

''علی اکبر نے تمام توجہ پڑھائی پر لگا دی اور جلد ہی ان ہم جماعت بچوں میں مقبول ہو گیا جنہیں وہ پڑھنے اور سبق سمجھنے میں مدد دیتا تھا۔ کئی ہم جماعت اسے اسکول کے بعد اپنے گھر لے جاتے۔ ان کے ماں باپ بھی خوش تھے کہ علی اکبر ان کی اولاد کو کھیل کود میں بھٹکانے نہیں بلکہ ہوم ورک میں مدد دینے ان کے گھر آتا تھا۔ وہ مٹھائیوں اور بسکٹوں سے اس کی تواضع کرتے۔ علی اکبر اپنے حصے کی مٹھائی اور بسکٹ بستے میں رکھ کر گھر لے آتا اور اپنے بھائیوں میں تقسیم کر دیتا۔ ایسی نعمتیں کھا کر بچوں کا شرارتیں کرنے کو جی چاہتا لیکن بی بی جان کی آنکھوں میں نمی اور میاں صاحب کی آنکھوں میں بے بسی دیکھ کر سہم جاتے اور اپنے اپنے کونوں میں دبک جاتے۔

''علی اکبر نے کبھی بچوں والے کھیل نہیں کھیلے لیکن کبھی کبھی شام کو کمپاؤنڈ سے باہر جمیل آرٹسٹ کی دکان پر اسے تصویریں بناتے دیکھنے چلا جاتا۔ جمیل آرٹسٹ کی دکان لکڑی کا ایک چھوٹا کھوکھا تھا جو چار ٹانگوں پر کھڑا تھا۔ یہ دکان کمپاؤنڈ کے بچوں کا شاپنگ مال تھی جہاں سے وہ مٹھائیوں اور سستی چاکلیٹوں کے علاوہ کاپیاں پنسل اور چھوٹے موٹے کھلونے خرید سکتے تھے۔ جمیل نے دکان کی چاروں ٹانگوں کے گرد ٹاٹ لپیٹ کر اندر اپنے رہنے کی جگہ بنائی تھی۔ زمین پر لکڑی کا ایک تختہ ڈال لیا تھا جو اسے زمین کی سیلن سے محفوظ رکھتا تھا۔ یہ جمیل کا گھر بھی تھا اور اسٹوڈیو بھی۔ جگہ اتنی اونچی نہیں تھی کہ وہ پوری طرح بیٹھ سکتا بس جھکے جھکے تصویریں بناتا اور تھک جاتا تو تختے پر کمر سیدھی کرنے لیٹ جاتا، کبھی کبھی سو بھی جاتا۔ شاید وہ سیدھا کھڑا ہونا بھول گیا تھا۔ جب باہر نکل کر کھڑا ہوتا تب بھی جھکا ہوا لگتا۔ جمیل ٹی بی کا مریض تھا تصویر بنانے کے دوران بار بار کھانسنے اور خون تھوکنے کے وقفے آتے۔ علی اکبر کا خیال

تھا جمیل کی تصویروں میں نمایاں نظر آنے والا سرخ رنگ اس کے تھوکے ہوئے خون کا ہے۔ بی بی جان کو تشویش تھی کہ جمیل آرٹسٹ کی بیماری علی اکبر کو نہ لگ جائے۔ لیکن علی اکبر کو پروا نہیں تھی۔ اسے جمیل آرٹسٹ کی تصویریں اور اسے تصویر بناتے دیکھنا اچھا لگتا تھا۔ اسے غربت کے اتنے ویکسین لگ چکے تھے کہ غربت سے پیدا ہونے والا کوئی جرثومہ اس پر اثر نہیں کر سکتا تھا۔

''ایک دن آرٹ کی یہ نمائش بند ہوگئی۔ ایک صبح جب جمیل کی دکان نہیں کھلی تو اسکول جاتے ہوئے ایک بچے نے جسے شاید کاپی یا پنسل کی ضرورت تھی ٹاٹ کا پردہ اٹھا کر دیکھا تو جمیل مردہ پڑا تھا۔ پولیس کو رپورٹ ہوئی، پولیس کے ساتھ رپورٹر اور فوٹو گرافر بھی آئے۔ دوسرے دن کے اخباروں میں غربت کی آگ میں جل کر مر جانے والے آرٹسٹ کا نوحہ چھپا تو مصوری کی دنیا کے بڑے بڑے سورما آ پہنچے۔ وہ جمیل کے کھوکھے کے نیچے سے برآمد ہونے والے فن کے شہ پاروں کی تخلیقی شدّت دیکھ کر حیران رہ گئے۔ جمیل آرٹسٹ کی تصویریں قومی اثاثہ قرار دے کر آرٹس کونسل پہنچا دی گئیں جہاں ان کی نمائش ہوئی۔ افتتاحی تقریب میں پائپ اور سگار پینے والے مصوری کے ناقدین اور آرٹ کے سرپرستوں نے فن کاروں کی بے قدری کے مرثیے پڑھے۔ آرٹسٹ مر کر سوا لاکھ کا ہو جاتا ہے اس لیے جمیل آرٹسٹ کی تصویریں بھی بہت مہنگی بکیں۔ جمیل کا وارث نہیں ملا تھا یا ڈھونڈنے کی کوشش نہیں کی گئی تھی اس لیے تصویروں کی فروخت سے حاصل ہونے والی آمدنی اور بچی ہوئی تصویریں غریب مصوروں کے امدادی فنڈ میں دے دی گئیں۔ یہ فنڈ ایک امیر بستی کے بنگلے میں قائم آرٹ گیلری نے شروع کیا تھا جس نے گیلری کا ایک کمرہ جمیل آرٹسٹ سے موسوم کر دیا تھا۔ جمیل آرٹسٹ مرنے کے بعد لکھ پتی اور امیروں کی بستی کا مکین ہو گیا تھا۔

''علی اکبر نے جمیل کی دکان پر آتے جاتے لوگوں اور گاڑیوں کا ہجوم دیکھا تھا۔ لیکن وہ آرٹ کی دنیا کے رموز نہیں جانتا تھا، اسے تو بس یہ پتا تھا کہ وہ جمیل آرٹسٹ کی طرح خون تھوک کر نہیں مرے گا۔ اسے غربت کو ہرانا تھا اور وہ بھی اپنی زندگی میں اور جلد سے جلد۔ ایک بار جب بی بی جان کے خوابوں کی تعبیر کا سرا اس کے ہاتھ آیا تو وہ یہ ڈور پکڑ کر اوپر اور اوپر چڑھتا گیا......''

''اوہو! تمہارا غربت کا افسانہ سنڈریلا کی کہانی بننے والا ہے۔''

''غربت کی کہانیوں میں اگر کوئی سنڈریلا نہ ہو تو وہ شاید کبھی نہ لکھی جائیں اور سنڈریلا تو جادو

کے زور سے ایک رات میں شہ زادی بن گئی تھی۔ علی اکبر کو دولت میں کھیلنے والا شہ زادہ بننے کے لیے بہت محنت کرنی اور بہت برس لگانے پڑے۔ آگے بڑھوں؟''

''ارشاد!''

''علی اکبر کے ایک ہم جماعت کا خاندان امیگریشن ملنے کے بعد آسٹریلیا جا رہا تھا۔ انہیں اپنے اکلوتے بیٹے کے بارے میں فکر تھی کہ ایک آزاد معاشرے اور نئے ماحول میں اس کی سانس نہ اکھڑ جائے۔ وہ علی اکبر کے حالات جانتے تھے، انہیں پتا تھا ان حالات میں رہنے والوں کے جسموں پر بہت مضبوط حفاظتی زرہ بکتر چڑھی ہوتی ہے۔ وہ علی اکبر کی ذہانت اور پڑھنے کی لگن سے بھی متاثر تھے۔ ان کا خیال تھا کہ علی اکبر ان کے بیٹے کے تعلیمی اور اخلاقی معاملات سنبھالے رکھنے میں ان کی مدد کر سکتا تھا۔ انہوں نے علی اکبر کو ساتھ لے جانے کی پیشکش کی تو میاں صاحب خاموش رہے۔ انہیں لگا ان کے دل کا ایک اور ٹکڑا کٹنے والا ہے، لیکن بی بی جان نے سینے پر سل رکھ لی اور ایک لمحے کا توقف کیے بغیر ہاں کر دی۔ انہیں اندازہ نہیں تھا کہ تعلیم کی کنجی اتنی جلدی ان سب کی تقدیر کا تالا کھول دے گی۔

''علی اکبر کو ساتھ لے جانے کی کارروائی آسان نہیں تھی۔ اس دوران کئی بارشیں آئیں اور ہمیشہ کی طرح ہر بارش میں میاں صاحب، بی بی جان اور چاروں بچے چارپائی پر دری اوڑھ کر بیٹھے۔ اب دری کے اندر بھی بارش ہونے لگی تھی۔ دری ان کی مشترکہ غم گسار تھی اور انہیں بارش سے بچانے کے ساتھ ساتھ ان کے آنسوؤں کا بھی پردہ رکھتی تھی۔ علی اکبر کے جانے کا وقت آیا تو میاں صاحب نے اپنی آنکھ نم نہیں ہونے دی اور خاموشی سے گلے لگا کر خدا حافظ کہا۔ بی بی جان نے کچھ دیر کے لیے سینے سے پتھر کی سل ہٹائی اور آنسو بہا کر بیٹے کو اللہ کے حفظ و امان میں دے دیا۔ تینوں بچے دیر تک بھائی کے پاؤں سے لپٹے واویلا کرتے رہے۔ علی اکبر نے سب کے جذبات باری باری اپنے اندر جذب کیے، اپنی دفاعی زرہ بکتر مضبوطی سے کسی اور تلوؤں میں ارادے کی مضبوط نالیں ٹھونک کر رخصت ہو گیا۔ بیگ صاحب! سن رہے ہو یا سو گئے؟''

''کیا فرق پڑتا ہے۔ مجھے لگتا ہے تم یہ کہانی مجھے نہیں اپنے آپ کو سنا رہے ہو۔''

''فرمائش تمہاری تھی۔''

''ہاں! مگر تم نے کہانی کے بجائے ناول کا پلاٹ شروع کر دیا۔ وہ بھی سپاٹ۔ صرف جمیل

آرٹسٹ کا ایک موڑ آیا تھا لیکن کہانی سے جڑا ہوا نہیں تھا۔''

''یار کہانی ابھی لکھی نہیں اور تم نے تنقید شروع کر دی۔ کیا ضروری ہے کہ ہر کہانی میں کوہان نکالا جائے۔''

''تمہاری شہرت انہیں کوہانوں کی وجہ سے ہے۔ چلو دیکھتے ہیں تمہارا ہیرو آسٹریلیا میں کس کروٹ بیٹھتا ہے۔''

''علی اکبر کی ذہانت اور محنت کا سکہ سڈنی کے اسکول میں بھی خوب چلا۔ وہ اپنے ہم جماعت کا ساتھ بھی نباہتا رہا جس کے ماں باپ اسے لے پالک بنا کر ساتھ لائے تھے۔ علی اکبر کو میاں صاحب سے وراثت میں اور کچھ نہیں بس خودداری ملی تھی۔ وہ جلد ہی اپنا خرچ اٹھانے کے قابل ہو گیا۔ وہ اسکول جانے سے پہلے علی الصبح محلے کے ایک نیوز ایجنٹ کے پاس اخباروں پر پلاسٹک لپیٹنے اور انہیں گھر گھر تقسیم کرنے کی نوکری کرتا۔ ہفتے کی چھٹیوں کے دونوں دن ایک فاسٹ فوڈ ریسٹورنٹ کا فرش صاف کرتا اور کوڑا سمیٹتا۔ مہینے بھر میں جو آمدنی جمع ہوتی اس کا بڑا حصہ بی بی جان کو بھیج دیتا۔ ڈالر روپے میں بدل کر اتنے ہو جاتے کہ اس کا خاندان جھونپڑی سے نکل کر نواحی بستی میں ایک مکان کرائے پر لے کر رہنے لگا تھا۔ سیمنٹ کا بنا ہوا ایک کمرے کا مکان تھا، چھت بھی نہیں ٹپکتی تھی، پھر بھی بارش ہوتی تو سب احتیاطاً دری اوڑھ کر ایک دوسرے کے سر میں سر ڈال دیتے۔ چھت کبھی بھی ٹپک سکتی تھی۔ لیکن اب دری کے اندر بارش نہیں ہوتی تھی، صرف خاموش دعائیں گونجتی تھیں۔ علی اکبر کی درازیٔ عمر اور ترقی کی دعائیں۔

''علی اکبر اور اس کے ہم جماعت نے اچھے نمبروں سے ہائی اسکول پاس کیا۔ علی اکبر کو یونیورسٹی میں داخلے کے لیے اسکالرشپ بھی مل گیا، لیکن اسے انجینئر، ڈاکٹر، وکیل یا آئی ٹی کا روبوٹ نہیں بننا تھا۔ اس کے سرپرست نے اپنے بیٹے کو شریک بنانے کی شرط پر اسے اپنا کاروبار شروع کرنے میں مدد دی تو علی اکبر نے اپنے چار سال یونیورسٹی کو دینے کے بجائے کاروبار پر لگا دیے۔ علی اکبر کے پاس کامیاب ہونے کے سب لوازمات تھے۔ وہ ان تھک محنت کرنا جانتا تھا، اسے کاروبار کرنے کا گر آ گیا تھا، قسمت کا بھی دھنی تھا، جہاں ہاتھ رکھتا سونا ہو جاتی۔ جو کام شروع کیا تھا اس کی فطری صلاحیت بھی رکھتا تھا۔ آرٹ اور Antiques کی چھوٹی سی دکان بڑھ کر آرٹ کی ڈیلر شپ بنی اور پھر تیزی سے پھیلتی گئی۔ اس کا ہم جماعت یونیورسٹی سے فارغ ہوا تو علی اکبر آسٹریلیا کے معاملات اس کے

حوالے کر کے نئے آفاق ڈھونڈنے نکل کھڑا ہوا اور آرٹ کی دنیا کے کئی قلعے فتح کر ڈالے۔ لندن، پیرس، نیویارک، دبئی، اس کی فتوحات سرحدیں پار کرتی رہیں۔

''علی اکبر کے ساتھ پاکستان میں اس کا خاندان بھی پھلتا پھولتا رہا۔ وہ اب ایک نسبتاً خوش حال مکینوں کی بستی میں تین کمروں کے ایک مکان میں رہتے تھے۔ اس کے تینوں بھائی اپنی تعلیم مکمل کر کے نوکریوں پر لگ گئے تھے اور بی بی جان ان کی شادیوں کے خواب دیکھنے لگی تھی۔ علی اکبر نے شادی کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ اسے خوف تھا عمارت کبھی بھی ڈھے سکتی تھی۔ غربت دوبارہ آ سکتی تھی۔ اس نے بہت آنسو دیکھے تھے، اسے نئے رونے والے نہیں چاہئیں تھے۔ ایک دن میاں صاحب بھی زندگی کا سفر ختم کر کے رخصت ہو گئے۔ مرتے وقت ان کے چہرے پر بہت آسودہ سی مسکراہٹ تھی۔ ان کے بچے بھوکے رہے لیکن انہوں نے کبھی خیرات یا فاتحہ کا کھانا نہیں کھایا، کسی کے سامنے ہاتھ نہیں پھیلائے۔''

''راشد بھائی کہانی ایک دم دوڑا دی۔''

''تمہاری تنقید نے ڈرا دیا ہے۔ ناول کو پھر سے افسانہ بنا رہا ہوں۔''

''آپ مجھ سے زیادہ جانتے ہو کہ افسانہ الفاظ کم کرنے سے افسانہ نہیں بنتا۔ یہ ایک واقعے پر محیط ہوتا ہے پوری زندگی پر نہیں۔''

''معلوم ہے، معلوم ہے۔ دو منٹ اور برداشت کرلو۔''

''ضرور، ضرور! لیکن آہستہ آہستہ، آرام سے۔ لپیٹنے کی کوشش مت کرو، میرے پاس تمھیں سننے کے لیے وقت ہی وقت ہے۔''

''علی اکبر کی پوری کوشش تھی کہ بی بی جان اس کے ساتھ آ کر رہیں۔ بی بی جان پہلے تو ٹالتی رہیں لیکن جب علی اکبر نے سننے سے انکار کر دیا تو آسٹریلیا آ گئیں۔ علی اکبر اب زیادہ وقت ماں کے ساتھ گزارتا تھا۔ کچھ کہنے کو نہ ہوتا پھر بھی ماں کی گود میں سر رکھے خاموش لیٹا رہتا۔ اس نے فرمائش کر کے کئی بار نمک مرچ کے پانی میں گھلی ہوئی املی اور مسالے میں پکی ہوئی باسی روٹی کی وہ ڈشیں بنوائیں جو اس کے بچپن کا من و سلویٰ تھیں اور جن کا ذائقہ آج بھی علی اکبر کے منہ میں بسا ہوا تھا۔ لیکن اسے پہلے جیسا مزا نہیں آیا۔ وہ حیرت سے سوچتا کیا بی بی جان کے ہاتھوں میں مزا نہیں رہا؟ ایک بارش میں ماں بیٹے چادر سر پر اوڑھے اور سر سے سر جوڑے دیر تک اس دری کو یاد کرتے رہے جس کے نیچے انھوں نے

کتنی ہی بارشیں گزاری تھیں اور کتنے ہی آنسو بہائے تھے۔

''بی بی جان کو جلد ہی یہ آسائش تکلیف دینے لگی۔ امارت کی اس دنیا سے انہیں وحشت ہو رہی تھی۔ ان کی زندگی پاکستان میں بھی آسان ہو گئی تھی لیکن وہاں تکلیفوں کا سامان بھی میسّر تھا۔ یہاں کرنے کے لیے کچھ نہیں تھا۔ صبح ایک چینی عورت آ کر گھر صاف کر جاتی۔ رات کو ایک پاکستانی باورچی کھانا پکا جاتا۔ علی اکبر نے جب بی بی جان کو پورا شہر گھما دیا اور ہر انڈین اور پاکستانی ریسٹورنٹ میں کھانا کھلا دیا تو بی بی جان نے پاکستان واپس جانے کا مطالبہ کر دیا۔ علی اکبر نے پھر بھی بہت دنوں تک روکے رکھا لیکن ضد بڑھ گئی تو انہیں واپس پاکستان چھوڑ آیا۔ علی اکبر پاکستان سے واپس آنے لگا تو بی بی جان نے اسے ان نظروں سے دیکھا تھا کہ علی اکبر کو لگا وہ اسے آخری بار دیکھ رہی ہیں۔ اس کا خیال غلط نہیں تھا۔ چند مہینوں بعد ایک دن بی بی جان چٹ پٹ ہو گئیں۔ دل کا دورہ پڑا اور ہسپتال پہنچنے سے پہلے روح پرواز کر گئی۔

''علی اکبر بھائیوں کے ساتھ غم غلط کرنے پاکستان آیا اور پہروں بی بی جان کی قبر پر جوگی بنا بیٹھا رہا۔ اس کے بھائیوں نے اسے قبر پکی نہیں کرانے دی لیکن اس نے قبر پر چھت ڈلوا دی تھی کہ بارش میں بی بی جان کہیں بھیگ نہ جائیں۔ نیچے قبر میں تو ان کے پاس دری بھی نہیں ہو گی! علی اکبر کے واپس جانے سے پہلے چاروں بھائی دری اوڑھ کر سروں میں سر ڈالے دیر تک روتے رہے۔ شاید آخری بار۔ علی اکبر وہ دری اپنے ساتھ آسٹریلیا لے آیا جس میں اس کے ماں باپ اور مرحوم بھائی کی خوشبوئیں بسی تھیں......''

''خاموش کیوں ہو گئے؟''

''بس اب تک کے لیے اتنا ہی۔''

''کہانی کا انجام کہاں ہے؟''

''ابھی ملا نہیں، جس دن مل گیا خبر کر دوں گا۔''

''مشکل ہے۔ مجھے لگتا ہے تمہاری یہ کہانی بے لکھی رہ جائے گی۔''

''تعریف کا شکریہ!''

''برا مت مانو۔ اس کہانی کا انجام ملنا مشکل ہے۔ سب کچھ تو ہو چکا ہے۔ ہیرو کروڑ پتی بن

گیا۔ ماں باپ سکون سے مر گئے ۔ بھائیوں کو نوکریاں مل گئیں، ان کی شادیاں اور بچے بھی ہو گئے ہوں گے ۔ اپنے محسن کے بیٹے کو پارٹنر بنا کر احسان بھی اتار دیا۔ اب انجام ڈھونڈنے کے لیے تمھیں نیا ناول شروع کرنا پڑے گا۔''

''ہو سکتا ہے۔ لیکن انجام ایک سطری بھی ممکن ہے۔''

''کیوں نہیں، اگر ایسا ہو سکے تو مجھے ضرور خبر کرنا۔''

''سب سے پہلے تمہیں ہی خبر ہو گی۔''

''مجھے گھٹن ہو رہی ہے۔ کہو تو اب پردے کھول دوں۔ ملین ڈالر کا منظر چھپائے بیٹھے ہو۔ جب آیا تھا تو گھٹائیں گھر کر آ رہی تھیں۔''

''ضرور کیوں نہیں، تمہارا گھر ہے۔''

''واہ! کیا جم کے بارش ہو رہی ہے۔ چھم چھم چھم چھم! راشد بھائی دیکھو۔ موسم سڈنی پر کتنا مہربان ہے...... ارے تمہیں کیا ہوا، تم نے یہ سر پر کیا اوڑھ لیا ہے۔ اتنے کپکپا کیوں رہے ہو...... راشد!...... راشد!......''

''بیگ صاحب! آؤ، تم بھی اس دری کے نیچے آ جاؤ، میرے سر میں سر ڈال کر بیٹھ جاؤ۔ آؤ! ورنہ بھیگ جاؤ گے......''

عمر کا حساب

''حفیظ تمہاری عمر کتنی ہے؟''

''کیوں؟''

''دوستوں کی عمر کا حساب کتاب رکھنا چاہیے۔''

''عمر چالیس سے اوپر ہو جائے تو پوچھنا بدتمیزی ہے۔''

''عورتوں کے لیے!''

''اکیسویں صدی میں عورت مرد سب ایک سے ہیں۔ بلکہ مرد عورتوں سے بدتر ہو گئے ہیں۔ عمر چھپانے کے لیے میک اپ تک کرنے لگے ہیں۔''

''کیا تم بھی؟''

''میں؟ ہاہاہا! میرے لیے بیوی کے میک اپ کا خرچ کافی ہے۔''

''تو بتاؤ۔''

''عمر بتائی نہیں، محسوس کی جاتی ہے۔ جب ہڈیاں تڑخنے اور برادہ بننے لگیں اور کھال تھیلا بن جائے تو سمجھو زوال کا موسم آ گیا ہے۔''

''پھر بھی۔''

''میٹرک کے سرٹیفکیٹ میں 1959ء لکھی ہے، لیکن ابا نے دو سال زیادہ لکھوائے تھے اس لیے سمجھو 48سال۔''

''یہ تو گزرے ہوئے سال ہیں۔''

''تو؟ عمر اور کیا ہوتی ہے؟''

''زندگی کے کتنے سال اور باقی ہیں۔ عمر اسے کہتے ہیں۔''

''تم شاید نئی بات کہہ کر چونکانا چاہتے ہو۔''

''بات نئی نہیں ہے، جو عمر تم گزار چکے ہو وہ تمھیں پتا ہے اور دوسروں کو بھی۔ کتنے سال اور باقی ہیں اصل عمر وہ ہے۔''

''وہ کسے پتا ہے۔ صرف خدا کو یا تمھیں بھی؟''

''دنوں یا مہینے کا تو نہیں، لیکن سالوں کا پتا مل سکتا ہے۔''

''جیوتش سے؟''

''نہیں! اوسط نکال کر۔ تمہارا ارتھمیٹک اچھا ہونا چاہیے۔''

''تو اے ارشمیدس! میری عمر کا حساب لگاؤ۔''

''تم پاکستان سے آسٹریلیا آئے تو کیا عمر تھی؟''

''25سال!''

''یعنی پاکستان میں تم 25سال تک رہے جہاں مردوں کی اوسط عمر زیادہ سے زیادہ 63سال ہے۔ تقریباً اتنے ہی سالوں سے تم آسٹریلیا میں ہو جہاں یہ اوسط اسّی سال ہے۔ اسی طرح تمہاری اوسط عمر ہوئی تقریباً 72سال۔''

''بہترین!''

''تمہارے ددھیال کے مردوں کی اوسط عمر کیا ہے؟''

''یعنی؟''

''تمہارے والد، دادا، چچا، تایا، وہ اگر اللہ کو پیارے ہوئے تو کن عمروں میں؟''

''ابا کا انتقال 68سال کی عمر میں ہوا۔ ایک چچا 66اور دوسرے 62سال کی عمر میں گئے۔ تایا

طبعی موت نہیں مرے ان کا زمین داری کے جھگڑے میں قتل ہوا تھا۔ اس وقت ان کی عمر......''

''ان کی عمر کی ضرورت نہیں۔''

''دادا کی عمر انتقال کے وقت 67 سال تھی۔ پردادا کے بارے میں سنا ہے وہ صرف 58 سال کی عمر میں انتقال کر گئے تھے۔ ان کی تین بیویاں تھیں اور وہ شہد بہت چاٹا کرتے تھے اس لیے شکر کی بیماری انہیں چاٹ گئی۔ ان سے پہلے کا شجرہ مجھے نہیں معلوم۔''

''اتنا کافی ہے۔ اب مجھے اوسط نکالنے دو۔ 68, 66, 62, 67, 58 اوسط ہوا تقریباً 64 سال۔''

''یعنی میری عمر آٹھ سال کم ہوگئی؟''

''جلدی نہیں۔ ابھی حساب باقی ہے۔ تمہارا جائے رہائش کا اوسط تھا 72 سال۔ اب جینز کے حساب سے اوسط 64 ہوا۔ دونوں کا مل کر اوسط نکلا 68 سال۔''

''کافی ہے۔''

''ابھی نہیں۔''

''اب کیا؟''

''تمہارا زندگی گزارنے کا چلن اچھا ہے۔ تم سگریٹ اور شراب نہیں پیتے۔ جہاں تک مجھے پتا ہے، ایک بیوی پر قناعت کرتے ہو۔ اِدھر اُدھر منہ نہیں مارتے۔ شہر سے باہر رہتے ہو جہاں آلودگی کم ہے۔ شاید ورزش بھی کرتے ہو۔''

''ہفتے میں تین دن، ٹریڈمل پر۔ آدھا گھنٹہ!''

''طویل عمری کے قانون کے مطابق اس طرح تمہاری عمر میں دس سال کا اضافہ ممکن ہے۔ یعنی ٹوٹل ہوا 78 سال۔''

''واہ!''

''لیکن تمہاری خوراک صحت بخش نہیں ہے۔ وہی گھی چربی والے بھنے ہوئے گوشت کے سالن، چکنا پلاؤ، نہاری، پائے۔ تمہاری عمر کم از کم پانچ سال کم ہو جائے گی۔ کہاں پہنچے؟''

''73 سال! بہت ہیں۔''

''ابھی نہیں۔تم اگر وطن کی محبت میں ریٹائر ہو کر پاکستان چلے گئے تو وہاں کے ڈاکٹروں کا علاج تمہاری عمر تین سال کم کردے گا، یعنی تمہاری اوسط عمر ستر پر چلی جائے گی۔ بڑھاپا آسٹریلیا میں گزارا تو یہاں کا میڈیکل سسٹم تین چار سال اور کھینچ لے جائے گا۔ اگر کسی اولڈ ولیج میں رہنے چلے گئے تو وہاں کا لائف اسٹائل دو سال تک مزید سانسیں بحال رکھے گا۔ سمجھو آسٹریلیا میں رہے تو کم از کم 78 سال کی عمر پاؤ گے۔بس دو ایک سال اوپر نیچے ہو سکتے ہیں۔''

''مجھے وطن کی محبت میں عمر کے دس سال نہیں گنوانے۔ میں یہیں ٹھیک ہوں، لیکن اولڈ ولیج نہیں جاؤں گا۔عمر میں دو سال کم سہی گھر کا کھانا نہیں چھوڑوں گا۔''

''مبارک ہو بھائی حفیظ! ملاؤ ہاتھ۔تمہاری عمر کا حساب پکا ہو گیا۔تمہاری عمر 75 کے لگ بھگ ہوگی۔''

''شکریہ بھائی کریم! آپ نے میری فکر دور کردی۔ میں سوچتا تھا دو سال بعد پچاس کا ہو جاؤں گا اس کے بعد بونس کے آٹھ دس سال، اور بس!''

''عیش کرو میاں عیش۔''

''یقیناً! میں اب تک اس مشہور لطیفے کا کردار تھا جس سے ڈاکٹر نے کہا تھا تم سگریٹ نہیں پیتے، شراب نہیں پیتے، محبوبہ نہیں پالتے تو زندہ کیوں رہنا چاہتے ہو۔ میرا خیال ہے شراب شروع کرنی چاہیے، شاید شراب خانے میں کوئی محبوبہ بھی مل جائے۔''

''زندگی کا اوسط ایک دم کم ہو جائے گا۔''

''مقدّرات! اچھا اب چلتا ہوں۔''

''عیش کرنے؟''

''نہیں! بیوی کو یہ بری خبر سنانے کہ اس کے جلد بیوہ ہونے کا کوئی امکان نہیں۔ ہاہاہا۔''

''ایسا مت کہو۔ میں بھابی کو جانتا ہوں۔ وہ اگر ہندو ہوتیں تو تمہاری طویل عمری کے لیے ہر روز برت رکھتیں۔''

''تم بھی چلو۔ رستے میں ڈراپ کردوں گا۔''

''نہیں حفیظ، آج نہیں! آج میں ٹرین سے جاؤں گا۔ ابھی ایک کافی اور پیوں گا۔ مجھے اپنی عمر

کا حساب بھی لگانا ہے۔''

''اپنی عمر بڑھنے کی خوشی میں آج بل میں دوں گا۔ ویٹر!......''

''خدا حافظ!''

''اللہ حافظ!''

....

''کریم بھائی! آج اکیلے کافی پی رہے ہو؟''

''آؤ سریش آؤ۔ بیٹھو۔ میں حفیظ کا انتظار کر رہا تھا۔ آج وہ شاید دیر تک کام کر رہا ہے۔''

''حفیظ؟ آپ کا وہ دوست جو ویسٹ بینک میں کام کرتا ہے؟''

''ہاں وہی! کیوں؟''

''آپ کو نہیں پتا؟''

''کیا نہیں پتا؟''

''وہ کل شام ٹریفک کے حادثے میں ہلاک ہو گیا۔ میں نے ابھی ابھی خبروں میں دیکھا ہے۔''

''کیا؟''

''سامنے سے آتا ہوا ایک ٹریلر بے قابو ہو کر اس سے ٹکرا گیا۔ پوری گاڑی پچک گئی۔ وہ موقع پر ہی ختم ہو گیا۔''

''میرے خدا!''

''آئی ایم ساری! آپ بھی تو اس سے لفٹ لیتے تھے۔ اچھا ہوا، بھگوان کی کرپا سے آپ گاڑی میں نہیں تھے۔''

''میری عمر کا حساب ابھی تک ٹھیک ہے۔''

''عمر کا کوئی حساب نہیں کریم بھائی۔ کون جانے بھگوان کب کسے اور کیسے اٹھا لے۔''

''ہاں شاید! بس کبھی کبھی کوئی فائل جلدی بند ہو جاتی ہے۔ سریش تمہاری عمر کتنی ہے؟''

شکیلہ

بعض اوقات میں بالکل بے وقوف ہو جاتا ہوں۔ عام محاورے کی زبان میں ڈبّا، بلکہ ٹیوب لائٹ۔ دماغ کے خلیوں میں خودکار ردِعمل کنٹرول کرنے والے جوٹرانسمیٹرز لگے ہوتے ہیں وہ ناکارہ ہو جاتے ہیں۔ ریفلیکسز (Reflexes) کام کرنا چھوڑ دیتے ہیں لیکن آج قصور میرا نہیں تھا۔ پیٹ میں ہونے والے درد نے حواس معطل کر دیے تھے۔ دوستوں اور بھائیوں نے سمجھایا تھا پیٹ ٹھیک ہونے تک کراچی میں رہو، لیکن میرا سڈنی واپس پہنچنا ضروری تھا۔ درمیان میں دو روز کے لیے بینکاک میں بھی رکنا تھا۔ میں صبح اٹھتے ہی محلّے کے ڈاکٹر سے دوا لے آیا۔ دو خوراکیں کھاتے ہی طبیعت کافی بہتر لگنے لگی تھی۔ اس سے اگلے روز فلائٹ پکڑنے اور ایئرپورٹ تک جانے کی طاقت بھی آ گئی تھی۔ کمال کا ڈاکٹر تھا۔ فی خوراک سات گولیاں دی تھیں اور ساتھ میں دودھیا رنگ کا میٹھا شربت بھی۔ گولیاں ہر رنگ کی تھیں۔ پیلی، سفید، خاکی، لال، نیلی، بھوری، ایک دورنگی کیپسول اور ایک چکنی سفید گولی بھی تھی۔ ڈاکٹر نے ہر مرض کو للکارا تھا، ''بچ کے کہاں جائے گا۔''

لیکن کوئی نہ کوئی مرض ان سات گولیوں اور میٹھے شربت کی گرفت سے بچ نکلا تھا۔ بینکاک اترا تو ایئرپورٹ سے ہوٹل پہنچنا مشکل ہو گیا تھا۔ وہی پیٹ کا مروڑ اور بار بار کے چکّر۔ دونوں دن ہوٹل کے کمرے میں پڑا سات گولیوں کی خوراک کھاتا اور تڑپتا رہا۔ وقفے وقفے سے ایک موج اٹھتی، جیسے استاد

غلام علی خاں پیٹ میں بیٹھے مرکیاں لگا رہے ہوں'' دل میں اک لہری اٹھی ہے ابھی'' خاں صاحب پیٹ کو دل کہہ رہے تھے۔ مجھے ڈر تھا اگر درد بڑھ گیا، سڈنی کی فلائٹ نہ پکڑ سکا اور اسی کمرے میں درد سے تڑپتے تڑپتے مر گیا تو بیوی کو کتنا غصہ آئے گا۔ میرا جھوٹ پکڑا جائے گا۔ میں نے اپنی بیوی کو نہیں بتایا تھا کہ کراچی آتے یا جاتے بینکاک میں رکوں گا۔ اسے بینکاک سے سخت چڑ تھی۔ کئی سال پہلے سڈنی سے کراچی جاتے ہوئے پہلی بار درمیان میں بینکاک رکنے کا پروگرام بنایا تھا تو اس نے شعلہ بار نگاہوں سے دیکھتے ہوئے بہت شکی لہجے میں پوچھا تھا۔

''تم بینکاک کیوں جا رہے ہو؟''

''تمہیں پتا ہے میں درمیان میں رکے بغیر اتنا طویل ہوائی سفر نہیں کر سکتا۔'' میں نے سمجھانے کی کوشش کی تھی۔

''لیکن بینکاک کیوں؟'' مجھے جواب میں خاموش دیکھ کر اس کا موڈ بدل گیا تھا اور لہجہ نرم کر کے کہا تھا،

''ٹھیک ہے جا رہے ہو تو کپڑے ضرور بنوا لینا۔ ایک دو سوٹ، تین چار قمیصیں، کسی سردار کی دکان پر چلے جانا، میں ڈاکٹر فری مین سے پتا لے کر دوں گی۔ فری مین اپنے کپڑے وہیں سے سلواتا ہے۔ بتا رہا تھا سو ڈالر میں سوٹ سل جاتا ہے۔''

''تم جانتی ہو میں ان عام درزیوں کے سلے ہوئے سوٹ نہیں پہنتا۔'' مجھے غصہ آ گیا تھا۔ ''تم نے ڈاکٹر فری مین کے سوٹ دیکھے ہیں۔ کالر کی لمبی نوکیں اور ڈھلکے ہوئے کندھے، قمیص بھی ایسی کہ ٹائی باندھو تو کالر کتے کے کانوں کی طرح لٹک جاتا ہے۔''

''پانچ ڈالر زیادہ دے کر کسی بھی یورپی ڈیزائنر کا لیبل لگوا لینا۔ تمہیں صرف برانڈ نام پر پیسے پھینکنے کا شوق ہے۔ کیا ہوا وہ کیلوین کلائن کا سوٹ جو سات سو ڈالر میں خریدا تھا اور ایک بار پہن کر دل سے اتر گیا تھا۔ اور وہ آرمانی کا سوٹ وہ پیا کارڈن کی قمیص وہ......'' وہ کافی دیر تک میرے ایک ایک سوٹ اور قمیص کا قصیدہ گاتی رہی اور ایک بار پھر بینکاک پر آ کر اٹک گئی۔

''مجھے پتا ہے تم بینکاک کیوں جا رہے ہو۔ مجھے پتا ہے وہاں کیا رکھا ہے۔ درمیان میں رکنا ہے تو سنگاپور، کوالالمپور یا جکارتا میں رک جاؤ یا منیلا میں...... نہیں منیلا میں بھی نہیں۔ تم ابھی جاؤ اور کسی دوسری

ایئر لائنز کا ٹکٹ خریدو۔ میں خود تمہارے ساتھ ٹریول ایجنٹ کے پاس چلتی ہوں......'' میں خاموشی سے سنتا رہا۔ مجھے معلوم تھا وہ کچھ دیر اسی طرح اپنا غصہ اگلتی رہے گی اور پھر میڈیکل سنٹر جا کر اپنے مریضوں میں الجھے گی تو شام تک بینکاک کو بھول جائے گی۔ اس کے غصے کی لہر اسی طرح آتی تھی، بہت شور مچاتی اور جھاگ اڑاتی ہوئی اور جس تیزی سے آتی اسی تیزی سے واپس چلی جاتی۔

دراصل قصور پیٹ کے درد کا بھی نہیں تھا۔ مسئلہ یہ تھا کہ میرا علاج کرنے والی خود میری بیوی تھی۔ میں آج سڈنی آکر کسی اور ڈاکٹر کو پیٹ دکھانے جاتا تو کچھ نہیں ہوتا۔ کوئی کہانی نہیں بنتی، لیکن جب میری بیوی مجھے لینے ایئرپورٹ آئی تو مجھے دیکھ کر پریشان ہوگئی۔ میں پیٹ پکڑے ہوئے دوہرا ہو کر چل رہا تھا۔ چہرہ پیلا ہو گیا تھا۔ میری بیوی پر غصے کی طرح پریشانی کا حملہ بھی شدید ہوتا ہے۔ وہ مجھے ایئرپورٹ سے سیدھی میڈیکل سنٹر لے گئی اور مجھے ڈاکٹر فری مین کے حوالے کرنے کے بجائے خود میرا معائنہ کرنے لگی۔ میرے پیٹ کے ایک ایک انچ کو ہاتھ، کان اور اسٹیتھیکوپ لگا کر دیکھا، کمر ٹھونکی، بلڈ پریشر لیا اور پھر ڈاکٹر ڈگلس کی پیتھولوجی لیب لے جا کر سارے ٹیسٹ کرائے۔ میں نے وہ سات گولیاں دکھائیں جن کی ایک خوراک ابھی تک بچی ہوئی تھی۔ اس نے ساری گولیاں کچرے کے ڈبے میں پھینک دیں۔

''دوا ٹیسٹ کی رپورٹ آنے کے بعد۔ اس وقت تک صرف آرام اور مکمل پرہیز۔'' اس نے کہا اور مجھے واپس گھر لے آئی جہاں اس نے مجھے بستر میں لٹا کر لحاف میں لپیٹ دیا۔

میری پریشانی یہ تھی کہ وہ میرے سوٹ کیس پر لگا ہوا بینکاک کا ٹیگ نہ دیکھ لے۔ اس نے مجھے بھاری سوٹ کیس کو ہاتھ بھی نہیں لگانے دیا تھا۔ کہا تھا شام کو بیٹا یونیورسٹی سے آئے گا تو گاڑی سے اتار لے گا۔ مجھے بیوی کی پریشانی دیکھ کر اطمینان ہو گیا تھا۔ میں جانتا ہوں پریشانی کی وجہ میری بیماری ہو تو پھر میری بیوی کو کچھ نظر نہیں آتا۔ وہ میرے سرہانے چینی اور نمک ملے گنگنے پانی کا جگ رکھ کر اور ہاتھ میں سابودانے کا پیالا پکڑا کر نیچے باورچی خانے میں چلی گئی۔ دوبارہ آئی تو پیالہ اسی طرح ہاتھ میں دیکھ کر غصے میں آ گئی۔

''تم نے اب تک کھایا نہیں؟''

''تمہیں پتا ہے مجھے پسند نہیں ہے۔''

''کوئی بات نہیں۔ دوا سمجھ کر کھالو۔'' اس نے جلدی جلدی اپنے ہاتھ سے چمچا بھر بھر کر میرے منہ میں ڈالا اور پھر میری ہتھیلی پر اسپغول کی بھوسی چھڑکنے لگی۔

''پھانک کر پانی پی لو۔''

''تمہیں پتا ہے مجھے پسند نہیں ہے۔'' میں نے اپنا احتجاج دہرایا۔

''پتا ہے تمہیں کوئی اچھی چیز پسند نہیں ہے۔ میں بھی پسند نہیں ہوں۔ لیکن اب کچھ نہیں ہوسکتا۔ منہ بنائے بغیر نگل جاؤ۔''

مجھے معلوم تھا وہی کرنا ہے جو وہ کہہ رہی ہے۔ بیمار ہونے کے بعد مکمل اختیار اس کے ہاتھ میں چلا جاتا تھا۔ وہ مغربی دواؤں سے علاج کرنے والی ڈاکٹر تھی لیکن اسے گھر والوں پر حکیمانہ نسخے آزمانے کا شوق تھا۔ کسی کوز کام ہوا تو جوشاندہ ابلنے لگا۔ کھانسی آئی تو ادرک پسنے لگی۔ وہ مجھے ایک بار پھر لحاف میں دھنسا کر اور بچے کی طرح تھپکیاں دے کر چلی گئی۔ میڈیکل سنٹر میں اس کی ڈیوٹی آٹھ بجے ختم ہوتی تھی۔

میرا دھیان پھر اپنے سامان کی طرف چلا گیا جو ابھی تک گاڑی کے بُوٹ میں پڑا تھا۔ امید ہے اسے بُوٹ کھولنے کی ضرورت نہیں پڑے گی۔ ویسے میں اب بینکاک جانا بند کر دوں گا۔ بیوی کو پتا چل گیا تو خواہ مخواہ اس کے ہاتھ میں ترپ کا پتا آ جائے گا۔ بات بات پر حوالہ دے گی۔ اس بار بھی نہیں جاتا، لیکن بینک میں سب نے کہا تھا تھائی کرنسی کا بھاؤ گر گیا ہے، ہر چیز کوڑیوں کے بھاؤ ہے، حالانکہ کچھ بھی سستا نہیں تھا سوائے ایک چیز کے، لیکن میرے تو پیٹ میں درد تھا۔ مجھے یقین ہے بیوی کو دھوکہ دینے کی سزا مل رہی تھی۔ ہوٹل کے کمرے میں دونوں دن اکیلا پڑا تڑپتا اور دل میں دعائیں مانگتا رہا تھا یا اللہ اس بار معاف کر دے، اب کبھی بینکاک نہیں آؤں گا۔

آنے کی کوئی وجہ بھی نہیں رہی تھی۔ وہ بھی نہیں رہی تھی جس کے لیے آیا کرتا تھا۔ پھر بھی ایک عادت سی ہوگئی تھی۔ سب گلیاں جانی پہچانی لگتیں۔ وہ ہاتھی تک پہچانتا تھا جو پتلی گلی والے شراب خانے کے اسٹول پر مجھے بیٹھا دیکھ کر اپنی گردن اور سونڈ ہلاتا، میں پلیٹ میں رکھی ہوئی مونگ پھلی کے سارے دانے اس کی سونڈ میں الٹ کر مہاوت کے ہاتھ میں سو بھات کا نوٹ رکھتا تو گھٹنوں کے بل جھک کر میرا شکریہ ادا کرتا اور پھر جھومتا ہوا آگے بڑھ جاتا۔ نوٹوں کے رنگ وہ بھی پہچانتا تھا۔

شکیلہ نے ایک بار مجھے ڈرایا تھا کہ سدھائے ہوئے یہ ہاتھی کبھی کبھی دیوانے ہو جاتے ہیں۔ اس نے بتایا تھا ایک دفعہ کسی ہاتھی نے گلی میں کھڑی ہوئی ایک کار کا بونٹ پاؤں مار مار کر پچکا دیا تھا۔ گاڑی میں بیٹھا ہوا ڈرائیور بڑی مشکل سے نکل کر بھاگ سکا تھا۔ مجھے یقین تھا شرارت کار والے کی ہوگی۔ اس نے شاید جعلی نوٹ دینے کی کوشش کی ہوگی۔ ایک بار میں نے سو کے بجائے پچاس کا نوٹ دیا تھا تو ہاتھی نے آگے بڑھنے سے انکار کر دیا تھا، لیکن پچاس کا دوسرا نوٹ ملتے ہی گھٹنوں پر آ گیا تھا۔ اس کی پیٹھ پر بیٹھے ہوئے ہڈیوں کے ڈھانچے نے بہت معصومیت سے مسکرا کر ہاتھ جوڑ دیے تھے۔

ہوسکتا ہے شکیلہ صحیح کہتی ہو اور ہاتھی اپنے مالک کے اشاروں پر جھکتا، بیٹھتا اور سونڈ ہلاتا ہو۔ مجھے تو دونوں ہی بہت معصوم لگتے تھے، لیکن معصوم تو شکیلہ بھی بہت تھی یا شاید وہ میری اپنی معصومیت تھی جس نے میو کو شکیلہ بنا دیا تھا۔ وہ میرا بینکاک کا پہلا دورہ تھا جس نے بینکاک کے سالانہ دوروں کی راہ کھول دی تھی۔ میں سڈنی سے کراچی جاتے ہوئے پہلی بار بینکاک رکا تھا تو بارہ گھنٹے کے سفر کے بعد ایئر پورٹ سے ہوٹل تک پہنچتے پہنچتے تھکن بری طرح غالب آ گئی تھی۔ سخت گرم اور رطوبت زدہ دن تھا۔ سامان اٹھانے والا پورٹر کمرے تک پہنچتے پہنچتے مجھے اس بات پر قائل کر چکا تھا کہ ٹھنڈے کمرے میں بدن کی اچھی سی مالش مجھے شام کی تفریحات کے لیے تازہ کر دے گی۔ میں نے پھر بھی ہاں نہیں کی تھی، لیکن اس نے میری خاموشی کو ہاں سمجھ لیا تھا اور ایک گھنٹے بعد ہی مسکراتی ہوئی میو میرے کمرے کا دروازہ کھٹ کھٹا رہی تھی۔

وہ تقریباً ایک گھنٹے تک بہت جی جان سے محنت کرتی رہی۔ اس نے میرے جسم کی ایک ایک ہڈی اور ایک ایک ریشے کو چٹکا کر نیا کر دیا تھا۔ آخر میں جب اس نے میرے سر کو جھٹکے دے کر گردن کی ہڈی چٹخائی تو میری چیخ نکل گئی تھی اور اس کے ساتھ ہی تمام جسمانی اور اعصابی تھکن بھی۔ مالش ختم ہونے کے بعد میں تولیہ باندھے کرسی پر بیٹھا تھا اور وہ اپنے کپڑے اور میک اپ درست کر کے میرے دیے ہوئے پیسے گن رہی تھی۔ میری بھوک کھل گئی تھی۔ میں نے اسے بھی کھانے کی دعوت دی۔

''نہیں شکریہ! آج میرا روزہ ہے۔''

''روزہ؟'' مجھے یاد آ گیا کہ شاید چوبیسواں روزہ تھا۔ میں کراچی عید کرنے جا رہا تھا۔ یہ جان کر کہ وہ مسلمان تھی مجھے سخت حیرت ہوئی۔

''تو پھر یہ سب کچھ......؟'' میری سمجھ میں نہیں آیا کہ کیسے کہوں۔

''یہ میرا کام ہے، نہیں کروں گی تو میرے ساتھ میرے بچے اور ماں باپ بھی بھوکے مریں گے۔'' اس نے بہت سیدھی سی وجہ بتائی اور گیند میری کورٹ میں ڈال دی۔ ''تم روزہ نہیں رکھتے؟''

''تمہیں کیسے معلوم کہ میں بھی مسلمان ہوں؟'' میں نے شرمندہ ہوئے بغیر کہا۔ جواب میں وہ مجھے حیرت سے دیکھنے لگی۔ میں شرما کر اپنی کمر کے گرد بندھی ہوئی تولیہ ٹھیک کرنے لگا۔

''مجھے اب جانا ہے، میرا گھنٹہ پورا ہو گیا ہے۔'' اس نے اٹھتے ہوئے کہا۔

''تمہارا روزہ ہے، آج تم آرام کرو۔'' میں نے اسے مزید ایک گھنٹے کے پیسے دے کر روک لیا۔ وہ دوسرے صوفے پر نیم دراز ہو کر ٹوٹی پھوٹی انگریزی میں اپنی کہانی سنانے لگی۔ اس کی کہانی میں کوئی نئی بات نہیں تھی۔ وہی غربت کی پرانی داستان۔ اس کا تعلق شمالی تھائی لینڈ کے کسان خاندان سے تھا۔ بوڑھے ماں باپ، بیمار شوہر اور دو بچوں کو پالنے کے لیے کام کی تلاش میں بینکاک آئی تھی جہاں صرف ایک ہی کام ملنا آسان تھا۔

''تمہیں اب یہ کام کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔'' میں نے اپنا دایاں ہاتھ بلند کر کے یہ جذباتی اعلان کیا تو وہ حیرت سے مجھے دیکھنے لگی۔ اپنی ایک ہم مذہب کی داستانِ غم سن کر میرا جذبۂ ایمانی بے دار ہو گیا تھا یا شاید اندر سے ضمیر کی کسی خلش نے ڈس لیا تھا۔

''تم کسی شریفانہ کام کی تربیت لو۔ میں سارا خرچ برداشت کروں گا۔'' اس کے چہرے پر تشکر اور احسان مندی کے جذبات ابھر آئے۔ میں نے اسے مزید ایک گھنٹے کی اجرت دی اور دوسرے تمام دن کی اجرت دینے کا وعدہ کیا۔

اسے دوسرے دن صبح دس بجے آنا تھا لیکن وہ ایک سے پہلے نہیں آئی۔ اس دن میں نے بھی روزہ رکھا تھا۔ ہم دن بھر شہر میں گھومتے رہے، میں نے اس کے اور اس کے بچوں کے لیے عید کے نئے کپڑے خریدے، ایک ساتھ افطار کیا اور رات کو ایک اچھے سے ہوٹل میں کھانا کھایا۔ اس نے مجھے بتایا وہ یہ کام چھوڑ رہی ہے، کل وہ اپنے لیے نئی کھولی بھی تلاش کر لے گی۔ مجھے اس کے چہرے سے نور کی کرنیں پھوٹتی نظر آئیں۔ میرے لیے تو جیسے جنت کے دروازے کھل رہے تھے۔ مجھے اپنی خود غرضی پر غصہ آ گیا۔ کیا میں یہ سب کچھ جنت میں جانے کے لیے کر رہا ہوں؟ وہ میری ہم مذہب تھی مجبوراً یہ سب

کچھ کر رہی تھی۔ اسے اس کیچڑ سے نکالنا میرا فرض تھا۔ میں نے سب کچھ سوچ لیا تھا اور اسے بتا بھی دیا تھا۔ پانچ سوڈالر مہینے میں اس کے تمام اخراجات پورے ہو سکتے تھے، ساتھ ہی وہ پڑھائی شروع کر سکتی تھی۔ اتنے پیسے میں اسے آسانی سے بھیج سکتا تھا۔

میری پرواز دوسرے دن اعلی الصبح تھی وہ اس رات میرے کمرے میں رک گئی، وہیں سحری کی اور کمرہ چھوڑنے سے پہلے میرے گلے لگ کر سسکیاں لینے لگی۔ ''میرے بغیر وہ اتنے دن کیسے گزارے گی!'' اس کی معصومیت میری رگ رگ میں بس گئی تھی۔ ایک ہی دن میں کتنا قریب آ گئی تھی، کتنی محبت کرنے لگی تھی۔ میں نے جب بتایا کہ چار ہفتوں کی بات ہے اور میں کراچی سے سڈنی واپس جاتے ہوئے ایک رات کے لیے پھر بینکاک میں ٹھہروں گا تو اسے قرار آ گیا۔

مہینے بھر بعد میں بینکاک اترا تو وہ ایئرپورٹ پر مجسم انتظار بنی کھڑی تھی۔ مجھے دیکھتے ہی آ کر لپٹ گئی۔ میں بری طرح جھینپ رہا تھا، دائیں بائیں کئی پاکستانی کھڑے تھے جو اسی پرواز سے اترے تھے اور دیکھ دیکھ کر مسکرا رہے تھے۔ وہ اس رات بھی میرے ساتھ میرے ہوٹل میں رہی۔ اس رات بھی میں ضبط کے کڑے امتحان سے گزرا۔ دوسرے روز وہ مجھے ایئرپورٹ چھوڑنے آئی اور جاتے ہوئے بہت دیر میرے سینے سے لگی رہی۔ اس کے محبت کرنے کے والہانہ انداز نے مجھے خوف زدہ کر دیا تھا۔ وہ بھی شادی شدہ تھی اور میں بھی۔ بیوی کی شبیہہ سامنے آتے ہی میں کانپ گیا۔ میرے لیے میو کی مدد نیکی کا کام تھی اور کچھ نہیں۔ میں نے اسے گناہ کی دلدل سے نکالا تھا۔ میں اس کے ساتھ اب خود اس دلدل میں کیسے کود سکتا تھا۔ سال بھر اس کی نظروں سے دور رہوں گا تو اس کے جذبوں کو قرار آ جائے گا۔ میں خود کو سمجھاتا ہوا سڈنی روانہ ہو گیا۔

میں اپنے وعدے کے مطابق ہر مہینے اسے پانچ سوڈالر بھیجتا رہا۔ میں نے وہ سال بہت بے چینی میں گزارا تھا۔ سال ختم ہوا اور میں کراچی جاتے ہوئے بینکاک اترا تو وہ ایئرپورٹ پر موجود تھی۔ میں اسے دیکھ کر خوش ہو گیا۔ میری محنت رنگ لائی تھی۔ اس نے سر پر اسکارف باندھا ہوا تھا جس سے اس کے سر کے بال، ماتھا اور بھنویں تک ڈھک گئی تھیں۔ ہونٹوں پر سرخی اور گالوں پر غازہ نہیں تھا۔ مجھے اس کی سادگی میں حوروں جیسی پاکیزگی نظر آئی۔ ہوٹل آ کر میں نے اسے وہ تحفے دیے جو میں اس کے اور اس کے خاندان والوں کے لیے لے کر آیا تھا۔ وہ بار بار مجھے گلے لگا لیتی۔ میں ہر بار ڈر جاتا۔ وہ

بتا رہی تھی کہ سب کو اس کا نیا نام پسند آیا ہے۔ سب اسے شکیلہ کے نام سے پکارتے ہیں۔ میں دل ہی دل میں شرمندہ ہونے لگا۔ وہ شکیلہ نہیں تھی۔ میں نے اسے غلط نام دے دیا تھا۔

شکیلہ ایک نام نہیں، جوانی کے عہدِ زرّیں کی ایک مکمل تاریخ تھی۔ یہ ایک جذبے کا نام تھا۔ زندگی میں جو پہلی لڑکی آئی تھی صرف اس کا نام شکیلہ تھا۔ اس کے بعد جس جس کے نام پر دل دھڑکا، زندگی میں جو لڑکی آئی، اس کا جو بھی نام ہو اسے شکیلہ کا نام مل گیا۔ یہ کالج کے زمانے کا کوڈ ورڈ تھا۔ جملہ حقوق محفوظ کرنے کی سند۔ ہر دوست کا کوڈ ورڈ الگ تھا۔ کسی کا جمیلہ، کسی کا راحیلہ اور کسی کا شمیمہ، میرے حصے میں شکیلہ آیا تھا۔ آنکھوں کے سامنے ایک ایک کر کے ساری شکیلائیں گزر گئیں۔ برقعہ والی جسے میں نے انگریزی میں پاس کرایا تھا، بڑے بڑے شیشوں کے چشمے والی پرکٹی جسے میں افسانے لکھ کر دیتا تھا، بڑی بڑی آنکھوں والی شکیلہ نمبر تین جس کے بھائی کو ابا سے کہہ کر بینک میں نوکری دلوائی تھی۔ شکیلہ نمبر چار، پانچ، چھ...... کیسے کیسے چہرے نگاہوں کے سامنے آ گئے۔ ہونٹوں پر مسکراہٹ کھیلنے لگی۔

اچانک فون کی گھنٹی بجی۔ مجھے معلوم تھا میری بیوی ہوگی پوچھے گی سابودانہ کھایا یا نہیں۔ اندازہ غلط نہیں تھا۔ لیکن یہی وہ لمحہ تھا جب میں بالکل بے وقوف ہو گیا تھا، عام محاورے کی زبان میں ڈبا، بلکہ ٹیوب لائٹ، دماغ کے خلیوں میں خودکار ردِ عمل دینے والے جو ٹرانسمیٹرز لگے تھے وہ ناکارہ ہو گئے تھے اور ریفلیکسز (Reflexes) نے کام کرنا چھوڑ دیا تھا۔ شکیلہ نمبر سات کا چہرہ معدوم ہونے لگا تھا۔ فون پر دوسری طرف سے آتی ہوئی بیوی کی آواز میں بہت غصہ بھرا ہوا تھا۔

''سارا قصور شگیلا کا ہے۔''

''شکیلہ؟ لیکن تمہیں کیسے معلوم؟'' میرے منہ سے نکلا۔

''شکیلہ نہیں شگیلا، وہ جرثومہ جس نے پیٹ میں گھس کر تمہیں بیمار کر رکھا ہے۔ لیکن ٹھہرو۔ یہ شکیلہ کون ہے جس کے بارے میں مجھے نہیں معلوم۔ ٹھیک ہے میں سمجھی، تم اسی کے لیے دوڑ دوڑ کر پاکستان جاتے ہو، میرے منع کرنے کے باوجود جاتے ہو، بتاؤ کون ہے وہ چڑیل! بتاؤ ورنہ میں کل ہی ٹکٹ لے کر پاکستان جاتی ہوں۔ میں اسے چھوڑوں گی نہیں۔ میں......''

مجھے پتا تھا اس وقت میرا خاموش رہنا ہی ٹھیک تھا۔ پیٹ میں ایک بار پھر شگیلا نے ڈنک مارا تھا۔ پھر وہی شکیلہ! شکیلہ نہیں شگیلا۔ شگیلا۔ میں نے آنکھیں بند کر لیں۔ شکیلہ نمبر آٹھ کا چہرہ پھر ابھرنے

لگا۔ مجھے بینکاک کا پچھلا سفر یاد آ گیا۔

نیکی کے کام میں جو سرمایہ کاری کی تھی وہ پھل دے رہی تھی۔ میں بینکاک پہنچا تھا تو شکیلہ کے چہرے پر کچھ زیادہ ہی نور نظر آیا تھا۔ اس بار میری پرواز صبح پہنچی تھی۔ ہمیشہ کی طرح شکیلہ ایئرپورٹ پر سراپا انتظار بنی کھڑی تھی۔ ہوٹل پہنچتے پہنچتے دوپہر ہوگئی تھی...... وہ میرے ساتھ لنچ کر کے چلی گئی۔ اس نے بتایا وہ ہیئر ڈریسنگ کا کورس کر رہی ہے، چار بجے سے اس کی کلاس تھی۔ میں بھی تھکا ہوا تھا، بستر پر لوٹتا رہا۔ شام کو تیار ہو کر باہر نکلا تو ہلکی ہلکی بوندیں پڑ رہی تھیں۔ بدن میں سنسنی دوڑنے لگی۔ سوچا بینکاک آئے ہو تو آنے کا کوئی فائدہ اٹھاؤ۔ شکیلہ کو تو ہاتھ لگانا بھی گناہ تھا۔ اتنا بڑا شہر بازو کھولے کھڑا تھا، کوئی اور سہی۔ شکیلہ کو کیا پتا چلے گا۔ میں ٹیکسی میں بیٹھ کر ڈرائیور سے کسی مساج پارلر کا پتا پوچھنے لگا...... ڈرائیور کی باچھیں کھل گئیں۔ اس نے کئی بروشرز اور تصویروں کے البم میرے ہاتھ میں تھما دیے۔ مجھے انہیں دیکھنے میں دلچسپی نہیں تھی۔ کسی بھی قریبی جگہ لے جانے کو کہا تو وہ مجھے کلوپیٹرا لے آیا۔

شیشے کی ایک بڑی سی دیوار کے پیچھے پچاس سے زیادہ لڑکیاں سینوں پر اپنا اپنا نمبر سجائے بیٹھی تھیں۔ کسی ایک کو چننا آسان نہیں تھا۔ میں حسیناؤں کے اس ہجوم میں اپنے معیار کی لڑکی تلاش کرنے لگا، اچھے جسم والی جو شکل سے معصوم لگے، سر جھکا کر خدمت کرنا ایمان سمجھے۔ 127 نمبر کی لڑکی اچھی تھی، لیکن ناک...... ناک ذرا موٹی اور پچکی ہوئی سی تھی۔ 221 کی ناک ستواں تھی لیکن سینہ سپاٹ تھا۔ 47 نمبر ٹھیک تھی، چہرہ، نقشہ، جسم، سب اچھا تھا، لیکن ماتھے پر تیوریاں چڑھی ہوئی تھیں، بہت نخرہ کرے گی۔ 312 ٹھیک تھی، کم عمر لگتی تھی، زیادہ تجربہ کار نہیں ہوگی، ناک نقشہ بھی اچھا تھا، یہی ٹھیک ہے۔ لیکن اسی وقت وہ اٹھ گئی۔ کسی اور نے اسے پسند کر لیا تھا۔ میری بیوی صحیح کہتی تھی۔ میں فیصلہ کرنے میں ہمیشہ دیر کرتا ہوں۔ لیکن تو نہیں اور سہی، یہاں کمی نہیں تھی۔ 307 پر آ کر نظریں جم گئیں۔ ہر طرح سے اچھی تھی، چہرے سے مسکین بھی لگ رہی تھی۔ میں نے فیصلہ کر لیا تھا اور ساتھ کھڑے ہوئے منتظم کو بتانے ہی والا تھا کہ وہ ہنس پڑی۔ توبہ! کتنی بیہودہ ہنسی تھی۔ دانتوں کی قطار بھی ٹیڑھی تھی۔ اچھا ہوا جو میں نے فوری فیصلہ نہیں کیا تھا۔ میری نظریں دوسرے چہروں اور جسموں کا طواف کرنے لگیں۔

نمبر 420۔ لڑکی اچھی تھی سب سے اوپر کی سیڑھی پر آخر میں بیٹھی تھی۔ کھلے ہوئے بال شانوں پر لہرا رہے تھے۔ سرخی میں پتے ہوئے ہونٹ بہت نمایاں تھے۔ مجھے اس کے نقوش جانے پہچانے

لگے...... آگے بڑھ کر ذرا غور سے دیکھا تو قدم جم گئے۔ ایسا لگا جیسے دل کی کوئی دھڑکن ایک لمحے کے لیے رک گئی ہو۔ جنت کے سب دروازے ایک دم بند ہو گئے تھے۔

وہ شکیلہ تھی۔ نہیں شکیلہ نہیں، میو جسے میں نے غلطی سے شکیلہ کا نام دے دیا تھا۔

کاش!

صحیح نام کیش تھا۔ترکی کے جنوب میں بحیرۂ اوسط کے کنارے چھوٹا سا ایک گاؤں۔قریب ترین ایئرپورٹ دلمان میں تھا جو کیش سے تین چار گھنٹے کی مسافت پر تھا۔سمندر کے ساتھ ساتھ چٹانوں کے کٹاؤ پر پتلی پیچ دار سڑک گھومتی ہوئی چلتی تھی۔دلمان کے ایک طرف فتحی تھا جو زیادہ دور نہیں تھا اور یا پھر انطالیہ جایا جا سکتا تھا جس کا اپنا ایئرپورٹ تھا۔دونوں زیادہ مشہور شہر تھے۔لیکن میں سیاحت کے لیے نہیں آیا تھا۔نہ ہی مجھے تاریخ وجغرافیے کا زیادہ شعور تھا۔مقدرات کا جبر مجھے کیش لے آیا تھا جو نقشوں میں بہت مشکل سے نظر آتا تھا۔مقدرات پر جتنا بھی یقین نہ کیا جائے اتنا ہی اپنے شکنجے میں کستے چلے جاتے ہیں۔

کیش سے واپسی کا سفر کرتے ہوئے دماغ میں بس یہی گردان تھی کہ کاش یہاں نہ آیا ہوتا۔ کاش ایسا نہ ہوا ہوتا۔عمر کے اس حصے میں زندگی کو ایک نیا موڑ دینا آسان نہیں تھا۔ جو گلی ایک بار چھوڑ دی تھی وہاں جانا تکلیف دہ عمل ہو سکتا تھا۔لیکن جو ہوا اور جو ہونا تھا وہ مقدر تھا۔ میں تو صرف استنبول گھومنے آیا تھا لیکن ایک انہونی کیش لے گئی تھی۔کاش میں نہ گیا ہوتا۔کاش!اسی کیفیت نے کیش کو کاش بنا دیا تھا،ایک خواب!ایک نافہم افسانہ!!

شروعات میرے ٹریول ایجنٹ کی ایک بھول سے ہوئی تھی اور پھر کڑی سے کڑی جڑتی گئی،سلسلہ بنتا گیا۔مجھے لندن جانا تھا اور میرا ٹریول ایجنٹ بکنگ کرانا بھول گیا تھا۔وقت سر پر آ گیا اور

میں نے یاد دلایا تو ایمریٹ ایئر لائنز کی کسی پرواز میں جگہ نہیں تھی۔ مجھے حیرت تھی، دبئی میں لوگ کم ہو گئے تھے، ایئر پورٹ بڑا اور پروازیں چار گنا ہو گئی تھیں، پھر بھی سیٹ ملنا دشوار تھی۔ ٹریول ایجنٹ نے ٹرکش ایئر لائنز میں لندن کی سیٹ لے دی۔ ساتھ ہی للچایا کہ استنبول میں مفت کا ٹھہراؤ ہے، سیزن نہیں ہے اس لیے ہوٹل بھی ستا مل جائے گا۔ استنبول میں چند دن ٹھہرنے کی خواہش ایک دم ہی جاگ پڑی اور میں اس وقت تک ٹریول ایجنٹ کے پاس سے نہیں اٹھا جب تک اس نے ٹکٹ اور ہوٹل کی بکنگ میرے حوالے نہیں کی۔

ایک بھولی بسری یاد تک پہنچنے کا راستہ اچانک ہی ہموار ہو گیا تھا، بس اب نشاط کو تلاش کرنا تھا۔ مجھے یقین تھا وہ استنبول میں ہی ہوگی۔ دوستوں نے یہی بتایا تھا۔ نشاط کی یاد آئی تو اس کی خوشبو آس پاس پھیل گئی۔ عجیب خوشبو تھی جو سونگھی نہیں صرف محسوس کی جا سکتی تھی۔ نیویارک یونیورسٹی میں کئی سال نشاط اور اس کی خوشبو کے ساتھ گزرے تھے۔ ہم دونوں ایم بی اے کر رہے تھے، لیکن وہ اچانک سب کچھ چھوڑ کر انقلاب کی ان دیکھی راہوں میں گم ہو گئی تھی۔ کبھی فلسطین، کبھی عالمی امن اور کبھی ماحولیات۔ اس کے جنون کو قرار نہیں تھا۔ میں نے حسبِ توفیق اس کے جنون کا ساتھ دیا تھا، لیکن اپنا ایم بی اے بھی مکمل کیا تھا اور نیویارک سے واپس آ گیا تھا۔ جب بھی نیویارک جانا ہوتا نشاط کو ڈھونڈ لیتا۔ ہر بار وہ پہلے جیسی لگتی۔ خوشبو بھی وہی تھی، بے چینی اور بے قراری بھی اسی طرح تھی۔ وہی بوہمین طرزِ زندگی تھی، جہاں رہنے کو جگہ مل رہ گئی۔ دنیا میں جہاں کہیں مظاہرہ ہوا، ادھار چندہ کر کے ٹکٹ لیا، تھیلا کندھے پر ڈالا اور پہنچ گئی۔ گزشتہ بار نیویارک گیا تھا تو نہیں مل سکی تھی۔ دوستوں نے بتایا تھا وہ ہمیشہ کے لیے استنبول واپس چلی گئی ہے۔ کسی نے مجھے اس کے برقی میل کا پتا دیا تھا۔ میں نے ای میل کیا بھی تھا، لیکن جواب نہیں ملا تھا۔

میں نے ای میل کا پتا تلاش کیا، اسے استنبول آنے کی خبر دی اور جواب کا انتظار کرنے لگا۔ شام گئے، دفتر سے اٹھنے سے کچھ دیر پہلے اس کا جواب آ گیا تھا۔ کمپیوٹر کی اسکرین پر جیسے قمقمے جلنے بجھنے لگے تھے۔ آس پاس نشاط کی خوشبو بھی پھیل گئی تھی۔ اس نے لکھا تھا میں اسے اپنے ہوٹل کا پتا اور آنے کا دن اور وقت بتا دوں، وہ ملنے پہنچ جائے گی۔ میں نے اسے جواب دیا اور دو دن بعد استنبول جانے والی اپنی پرواز کا بے چینی سے انتظار کرنے لگا۔ نشاط مل گئی تھی، استنبول میں ملنے کا وعدہ بھی ہو گیا تھا، اب تین دن

کیا، میں ایک ہفتہ استنبول میں رہ سکتا تھا۔لندن میں کوئی ایسا کام نہیں تھا جسے ٹالا نہ جا سکتا۔

دو دن بہت مشکل سے گزرے تھے۔ میں ایئرپورٹ پر کئی گھنٹے پہلے آ گیا تھا۔'چیک اِن' کا عمل بہت تیزی سے ہوا تھا، پرواز جانے میں دیر تھی اس لیے دبئی کی ڈیوٹی فری شاپس میں گھومنے کا فریضہ پورا کیا اور سیلز پر مامور فلپائنی، روسی اور مراکشی لڑکیوں کی مدد سے طرح طرح کی خوشبوئیں سونگھتا رہا۔ فیصلہ کرنا مشکل تھا کہ نشاط کے لیے خوشبو خریدوں یا نہیں۔سب اعلیٰ نسل کے مہنگے پرفیوم تھے،نشاط کے لیے بے معنی۔وہ ایک نظر ڈال کر کہیں رکھ دیتی،خوشبو سونگھنے کی بھی کوشش نہیں کرتی۔پھر بھی میں نے ایک مشور برانڈ کی شیشی خرید لی جس کی سفارش ایک دکان دار لڑکی بہت زور شور سے کر رہی تھی کہ آپ کی بیوی کے لیے بہت اچھی رہے گی۔ مجھے نہیں معلوم اس نے یہ کیوں فرض کر لیا تھا کہ ہر مرد کے پاس ایک بیوی کا، یا بیوی کے پاس ایک شوہر کا ہونا ضروری ہے۔اس کے حالاتِ حاضرہ کا علم شاید کمزور تھا۔اسے ابھی خبر نہیں ہوئی تھی کہ نئے معاشروں میں قید و بند کی یہ روایتیں کمزور ہو رہی ہیں۔

میں نے سوچ لیا تھا کہ نشاط کو پرفیوم کی شیشی دینے کے ساتھ اس پر خوشبو کا چھڑکاؤ میں خود کروں گا۔خوشبو کا یہ چھڑکاؤ اس کی وہ خوشبو گم کر دے گا جو مجھے پاگل کر دیتی تھی۔پاگل پن کا وہ زمانہ کچھ اور تھا جب ہم ساتھ پڑھتے تھے۔اُس وقت آتش جوان اور قویٰ مضبوط تھے۔نظریاتی اصولوں کا دباؤ تھا، دوستوں کا ہجوم بھی رہتا تھا لیکن اب سب کچھ بدل گیا تھا۔نظریاتی معاملات کب کے ختم ہو گئے تھے،قویٰ بھی مضمحل ہونے لگے تھے۔قویٰ جب کمزور ہو جائیں تو پھر خواہشیں زیادہ خودسر ہو جاتی ہیں۔استنبول میں نشاط کی خوشبو کے ساتھ اکیلا رہنا بہت مشکل ہوتا۔

پرفیوم خرید کر گیٹ نمبر ۲۱۸ پر آ کر بیٹھ گیا۔ابھی کافی وقت باقی تھا لیکن دکانوں میں سجے ہوئے ڈبے، بوتلیں اور ملبوسات دیکھنے کا شوق پورا ہو چکا تھا، یہ ڈر بھی تھا کہیں پرواز وقت سے پہلے اور اعلان کیے بغیر نہ روانہ ہو جائے۔لیکن جب مسافروں کو جہاز میں بیٹھنے کے لیے بلایا جانے لگا تو میں نے جلدی نہیں کی۔ مجھے اب یقین تھا کہ جہاز مجھے لیے بغیر نہیں اڑے گا۔

میں اپنے سامنے سے گزرتی ہوئی مسافروں کی قطار دیکھ کر حیران ہو رہا تھا کہ اتنے مختلف ممالک کے لوگ کیا کرنے استنبول جا رہے تھے۔کراچی جاتا تھا تو جہاز میں چند مسافروں کو چھوڑ کر سب پاکستانی ہوتے تھے۔آسٹریلیا جاتے ہوئے بھی اکثریت آسٹریلوی یا نیوزی لینڈ کے باشندوں کی نظر آتی

تھی،لیکن استنبول جانے والی اس پرواز میں ترکی کے باشندوں کی تعداد نصف سے بھی کم نظر آتی تھی۔ ہر ملک کے لوگ تھے، مجھ جیسے شکل وصورت سے ہندوستانی یا پاکستانی لگنے والے لوگ۔افریقی، جاپانی، چینی، اماراتی، یورپی نژاد اور کئی دوسرے عرب ممالک کے باشندے، تقریباً ہر خطّے کا انسانی جانور موجود تھا۔استنبول تک کی پرواز تھی اس لیے ظاہر تھا کہ سب کی منزل استنبول تھی۔

میرے برابر کی نشست پر جو شخص بیٹھا تھا وہ شکل وصورت سے ترکی کا لگتا تھا۔شیو بڑھا ہوا اور سخت تھکا ہوا۔اس سے وہ تعارفی باتیں بھی نہ ہوسکیں جو عموماً جہاز کے سفر میں برابر کی نشست پر بیٹھے ہوئے مسافر سے ہوتی ہیں۔اس نے سیٹ پر بیٹھتے ہی کمبل اوڑھ کر آنکھیں بند کر لی تھیں۔وہ شاید کسی لمبی پرواز سے دبئی ہوتا ہوا وطن واپس جا رہا تھا۔جہاز کے پہیوں نے جیسے ہی زمین چھوئی اس نے کمبل اتار پھینکا اور اس طرح چاق و چوبند ہو کر بیٹھ گیا جیسے تھکن پاس سے نہ گزری ہو۔موبائل فون کھلنے کی اجازت ملتے ہی اس نے بٹن دبائے اور شاید کسی کو اپنے آنے کی اطلاع دینے لگا۔آنکھیں جو کچھ دیر پہلے نیند سے بوجھل تھیں، چمکنے لگی تھیں۔ہونٹوں پر مسکراہٹ آگئی تھی۔میں سوچنے لگا وطن واپسی اور اپنوں سے ملنے کا خیال کتنی مسّرتیں بھر دیتا ہے۔یہ بھی خیال آیا کہ روز روز کے سفر نے مجھے وطن واپسی کی اس کیفیت سے کتنا بے گانہ کر دیا تھا۔مشکل یہ بھی تھی کہ گھر کسے کہا جائے۔دبئی،سڈنی یا کراچی؟؟

استنبول ایئرپورٹ پر امیگریشن سے گزرنے والوں کی لمبی قطاریں لگی تھیں۔ایسی ہی جیسی دبئی، بنکاک،لندن یا سڈنی جیسے ہر مصروف ایئرپورٹ پر لگی دیکھی تھیں۔لیکن اتنا وقت نہیں لگا جتنا خیال تھا۔ باہر ہوٹل کا ڈرائیور میرے نام کا کارڈ لیے کھڑا تھا۔گاڑی ایئرپورٹ کی حدود سے نکل کر ایک ایسی سڑک پر آگئی تھی جو سمندر کے ساتھ ساتھ چل رہی تھی۔رستے میں رنگ برنگ کے پھولوں کی روشیں آنکھوں کو خنکی دے رہی تھیں۔گاڑی کی کھلی کھڑکی سے آتے ہوئے ٹھنڈی ہوا کے جھونکے لطف دے رہے تھے۔بہت زمانے بعد گاڑی میں ایئرکنڈیشنڈ کے بغیر تازہ ہوا کھاتے ہوئے سفر کرنے کا مزا آیا۔

گاڑی نے بڑی شاہ راہ سے موڑ کاٹا اور استنبول کی پتلی اور پتھریلی گلیوں کے اتار چڑھاؤ طے کرنے لگی۔سیاحوں کو لے جانے والی بڑی بسیں اور دوسری ہر طرح کی گاڑیاں آگے پیچھے چل رہی تھیں، یا ایک دوسرے کا راستہ کاٹ رہی تھیں لیکن کسی میں بے صبری نہیں تھی،ایک بار بھی کسی گاڑی کا غصیلا ہارن سنائی نہیں دیا۔مجھے حیرت ہو رہی تھی۔ٹرک تو جنگ جو مانے جاتے تھے۔ان کے خون کی

گرمی کہاں گئی؟

ہوٹل آنے اور کمرے تک پہنچنے میں شام کے چھ بج گئے تھے۔قریب کی کسی مسجد سے اذان کی صاف آواز کمرے میں آ رہی تھی۔ میں کمرے میں رکھے ہوئے سیاحتی پمفلٹ پڑھتا رہا۔خیال تھا کچھ دیر آرام کرروں گا، پھر باہر جا کر آس پاس کا علاقہ دیکھوں گا اور کسی ریستوران میں بیٹھ کر ترکی کے کھانوں کا مزالوں گا۔لیکن سویا تو ایسا لگا کہ عمر بھر کی نیند آج ہی پوری ہونا تھی۔صبح سے پہلے آنکھ نہیں کھلی۔

آنکھ کھلتے ہی ریسپشن کوفون کر کے معلوم کیا کہ کسی کا فون تو نہیں تھا۔کوئی آیا تو نہیں تھا۔جواب نفی میں تھا۔نشاط نے شاید میرا ای میل نہیں دیکھا تھا۔ میں نے دبئی سے جوای میل کیا تھا اس میں ہوٹل کا نام اور فون نمبر لکھ دیا تھا۔ہوٹل شہر کے بیچ تھا، ڈھونڈ نا مشکل نہ ہوتا۔لیکن وہ نشاط تھی، عام انسانوں سے مختلف۔اس کا جنون اسے نہ جانے کہاں بھٹکا رہا ہوگا۔

سخت بھوک لگی تھی۔رات بھی کچھ کھائے بغیر سو گیا تھا۔تیار ہو کر ناشتے کے لیے پانچویں منزل کے ٹیرس پر پہنچا تو ایسا لگا کہ مسجد سلطان محمد یا صوفیہ جو کی چھت پر یا اس کے برابر کے کسی چھجے پر کھڑا ہوں۔سامنے مسجد کے گنبد تھے اور بائیں جانب صوفیہ جو کے۔کچھ دیر اس طرح حیرت کے عالم میں کھڑا رہا۔ترکی کے ویو کارڈ پر زندگی بھر جو منظر دیکھتا رہا تھا وہ اب سچ مچ میری آنکھوں میں گڑ گیا تھا۔دیر تک ناشتہ کرتا رہا،سر پر چھت نہیں تھی اور دھوپ کی شدّت بڑھ گئی تھی، پھر بھی بیٹھا رہا،اس وقت اٹھا جب ناشتے کا وقت ختم ہو گیا تھا اور برتن سمیٹے جا رہے تھے۔ٹیرس کے ایک کونے میں چھت ڈال کر چھوٹا سا حُجرہ بنا ہوا تھا،جس کے نیچے لال، پیلے اور ہرے رنگ کے بڑے بڑے گدیلے تکیے اور بان کی بنی ہوئی مضبوط آرام دہ کرسیاں پڑی تھیں۔ میں نیلی مسجد کا منظر آنکھوں میں بھرے ایک کرسی پر بیٹھا کافی پیتا رہا۔خوشی تھی کہ اب کچھ ہی دیر بعد اس منظر کے اندر داخل ہو جاؤں گا اور جب تک استنبول میں ہوں اس منظر کو آنکھوں میں بھر کر صبح کی کافی اور جوس پیوں گا۔اس وقت تک دیکھتا رہوں گا جب تک مسجد کی یہ پُروقار عمارت میری پتلیوں پر نقش نہ ہو جائے۔اسکرین سیور (Screen Saver) کی طرح جو ہم اپنے کمپیوٹر یا موبائل فون کی اسکرین پر سجا لیتے ہیں۔

نیچے لابی میں آ کر ریسپشن پر بیٹھی ہوئی لڑکی کو تاکید کی کہ کوئی مہمان آئے تو اس کا فون نمبر نوٹ

کر لے، میں ایک دو گھنٹے میں واپس آ جاؤں گا۔ میں نے ہوٹل سے نکل کر دائیں ہاتھ کا موڑ کاٹا تو سامنے ٹرام والی پتلی سڑک تھی۔ اسے عبور کر کے پانچ منٹ بعد ہی سلطان محمد کی نیلی مسجد کے احاطے میں داخل ہو رہا تھا۔ سیکڑوں کی تعداد میں لوگ آ جا رہے تھے، مسجد کے صحن سے گزر کر مسجد کے اندر جاتے ہوئے دروازے پر پلاسٹک کے تھیلے تھے۔ میں نے اپنے جوتے تھیلے میں بھر کر ہاتھوں میں لٹکا لیے۔ دائیں ہاتھ پر نیلے رنگ کے دوپٹوں کا انبار تھا، ان عورتوں کے لیے جن کے پاس سر ڈھانپنے کے لیے کچھ نہیں تھا۔

مسجد کے اندر آ کر کچھ دیر ایک ستون سے ٹکا مسجد کے در و دیوار اور گنبد کے اندرونی خلا میں بنے ہوئے خوب صورت نقش و نگار دیکھتا رہا اور پھر لکڑی کی اُس ریلنگ کو عبور کر کے جو سیاحوں اور نمازیوں کے درمیان حد بندی کے لیے کھڑی کی گئی تھی، آگے چلا گیا جہاں چند نمازی بیٹھے تھے۔ نماز کا وقت نہیں تھا لیکن میں نے دو نفل پڑھ کر اپنے ان آبا و اجداد کی روحوں کو ثواب پہنچایا جن کی سیکڑوں برس پہلے اس زمین کی مٹی سے نمو ہوئی تھی۔ میں آج سے کوئی پچیس برس پہلے بڈاپسٹ جاتے ہوئے دن بھر کے لیے استنبول رکا تھا تو نیلی مسجد میں بھی حاضری دی تھی لیکن نماز نہیں پڑھی تھی۔ اتنے برسوں بعد یہ کام بھی ہو گیا تھا۔

توپ کاپی اور صوفیہ کے عجائب گھر ساتھ ہی تھے، لیکن عجائب گھر میں بہت وقت لگ سکتا تھا اور نشاط کسی وقت بھی آ سکتی تھی۔ ہوٹل واپس آ کر پتا کیا، کوئی نہیں آیا تھا۔ ایک بار پھر لابی میں رکھے ہوئے کمپیوٹر پر ای میل چیک کی، نشاط کا کوئی پیغام نہیں تھا۔ میں نے اسے ایک اور پیغام بھیجا اور ہوٹل سے نکل آیا۔ ٹرام والی سڑک پر فٹ پاتھ پر بیٹھا ایک شخص پانچ ریال میں نام کی خطاطی کر رہا تھا۔ اس نے ایک منقش حاشیے والے کارڈ پر بہت خوب صورتی سے ترکی رسم الخط میں میرے نام کی خطاطی کی۔ خطاطی کا فن اس کی خاندانی میراث تھا جو اسے اس کے باپ نے سکھایا تھا۔ مجھے پاکستانی خطاط یاد آ گئے، وہ نسل جو مفقود ہوتی جا رہی تھی۔ ان کی اولادیں اب اردو کی خطاطی کے لیے کمپیوٹر استعمال کر رہی تھیں، لیکن وہ استادوں والی بات کہاں۔

ہوٹل سے دس منٹ کے فاصلے پر گرینڈ بازار تھا۔ میں ٹرام کی پٹری کے ساتھ ساتھ، فٹ پاتھ کے دونوں طرف بیٹھے کچھ نہ کچھ بیچنے والوں کے درمیان سے گزرتا ہوا اسی طرف چل نکلا۔ دائیں ہاتھ

پر زیادہ تر کیفے تھے یا نوادرات کی دکانیں، اور بائیں جانب جھمکے، پشمینا، ویو کارڈ اور ریفریجریٹر پر چپک جانے والے مقناطیس بیچنے والے۔ دونوں طرف سے بے شمار آنکھیں گھور رہی تھیں۔ نیلے رنگ کی یہ گول گول آنکھیں جوترکی کی پہچان ہیں، ہر سائز میں دستیاب تھیں۔ لٹکائے جانے والی بھی اور مقناطیس لگی ہوئی بھی۔ روایت ہے کہ یہ بدنظروں سے محفوظ رکھتی ہیں۔ ہر مکان اور دکان کے سامنے ایک آنکھ دیوار یا زمین میں نصب تھی۔

دونوں طرف رنگوں کی قوسِ قزح بکھری ہوئی تھی۔ وہ ہوٹل جہاں میں ٹھہرا ہوا تھا اس کے ٹیرس پر بیٹھنے کے لیے جو دیوان بنا تھا اس کے نشستی گدّے بھی مختلف رنگوں کے تھے۔ سرخ، پیلے اور ہرے۔ اور اب فٹ پاتھ پر دونوں طرف ہر چیز میں شوخ رنگ نمایاں تھے۔ رستے میں ایک بیکری آئی، اس کے شوکیس میں رکھے ہوئے کیک اور پیسٹریاں بھی رنگوں سے بجی ہوئی تھیں۔ ایک اور کیفے کے شوکیس میں جو سینڈوچ بنے رکھے تھے انھیں بھی رنگوں کی ترتیب سے بنایا گیا تھا، نارنجی، ہرے اور پیلے۔ کسی نے بتایا تھا کہ رنگوں کا حسن ڈپریشن سے محفوظ اور خوش رکھتا ہے۔ ترکی میں بھی شاید خوشیاں عام ہوں گی۔

رستے میں قالین اور جواہرات بیچنے والے اپنی اپنی دکان میں آنے کی دعوت دے رہے تھے۔ ایک دکان دار نے رستہ روک کر کہا ''آپ تو شکل سے بہت امیر لگتے ہیں!'' میں؟ مجھے ہنسی آگئی۔ یہ گاہک پھانسنے کی شاید نئی ترکیب تھی۔ مجھے یقین تھا وہ ہر آنے جانے والے سیّاح کو ان کے امیر ہونے کی نوید دے رہا تھا۔ میں اپنے امیر ہونے کا ثبوت دینے اس کی دکان میں نہیں گیا۔ ویسے ممکن ہے وہ صحیح کہہ رہا ہو۔ دوست کہتے تھے کہ آج کل میرے چہرے پر رعونت آگئی ہے جس سے میں خواہ مخواہ امیر لگنے لگا ہوں۔

دائیں ہاتھ کو مڑا تو اس سڑک پر قالین کی بڑی دکانیں تھیں۔ ایک دکان دار نے مجھے اندر آنے کی دعوت دی۔ میں نظر انداز کر کے آگے بڑھ جاتا لیکن اس کے لہجے میں بہت عاجزی تھی۔ میرے اندر چھپی ہوئی نرم دلی چہرے کی نمائشی رعونت پر حاوی آگئی۔ اندر ایزل پر جائے نماز کے سائز کا ایک بہت خوب صورت قالین سجا تھا۔ وہ قالین کا شجرہ نسب بتانے لگا کہ اس کی نسل کا سو سال پرانا ایک قالین سودبی کے نیلام گھر میں ایک ملین ڈالر میں بکا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ گیارہ ہزار پانچ سو ڈالر میں قالین کا یہ ٹکڑا خرید کر میں اپنی آنے والی نسلوں کے لیے ایک اچھی سرمایہ کاری کر سکتا ہوں۔ میری ہچکچاہٹ دیکھ کر

اس نے آخری قیمت کے طور پر دس ہزار ڈالر میں سودا طے کر لیا اور قالین ایزل سے اتار کر لپیٹنے لگا۔ میں بہ مشکل بچ کر باہر نکل سکا۔ کیا میں واقعی ایک چھوٹا سا قالین دس ہزار ڈالر میں خریدنے والا گاہک لگ رہا تھا؟ کوئی آئینہ نظر آتا تو اپنے چہرے پر چھائی ہوئی رعونت سے پوچھتا۔

میں گرینڈ بازار کے اس نہ ختم ہونے والے حصے سے گزر رہا تھا جس کے دونوں طرف جیولرز کی دکانیں تھیں۔ میں نے سوچ لیا تھا کہ اب کسی دکان دار کو آنکھوں کا رابطہ نہیں دوں گا، لیکن ترکیب کام نہیں آئی۔ ایک جوہری نے مجھے اچک لیا، اس سے جان چھڑا کر دائیں بائیں ہونے کی بجائے درمیان میں چلتا ہوا باہر نکل آیا۔ باہر ریستورانوں کی قطاریں تھیں اور ہر ریسٹورنٹ کے سامنے لال، پیلی یونیفارم میں لال ٹوپی کے پھندنے ہلاتے ہوئے نوجوان مینو کارڈ دکھا کر دعوتِ طعام دے رہے تھے۔

میری منزل استنبول یونیورسٹی تھی جو نقشے کے مطابق یہاں سے نزدیک تھی۔ میں جب کسی نئے شہر جاتا ہوں تو دو مقامات کا طواف کرنے کی کوشش ضرور کرتا ہوں۔ ایک یونیورسٹی اور دوسری لائبریری، جامعات اور لائبریری کی فضاؤں میں کتابوں کی مہک اور علم کو جو خوشبو بسی ہوتی ہے وہ ناک کے ذریعے دل و دماغ میں داخل ہو کر نئے گلزار سجا دیتی ہے۔ چھت والے پختہ گرینڈ بازار سے باہر نکلا تو فٹ پاتھ پر چھابڑی والے خریداروں سے قیمتوں پر سودے بازی کر رہے تھے۔ سیڑھیاں چڑھ کر اوپر آیا تو ایک چوک پر بہت سے کبوتر اپنے پر پھڑ پھڑا رہے تھے۔ ایک بوڑھی عورت ہاتھ میں دانوں بھرا کٹورا لے کر میرے پاس آئی، میں نے توجہ نہیں دی پھر بھی اس نے چٹکی بھر دانے ہوا میں اڑا دیے جس کے ساتھ ہی بہت سے کبوتر ایک ساتھ اڑے اور پھر زمین پر واپس آ کر دانہ چگنے لگے۔

میں دانہ چگتے کبوتروں کے درمیان سے گزر کر سامنے کی طرف بڑھا جہاں قدیم زمانے کے نقش و نگار سے مزّین ایک بڑا سا دروازہ اور اس کے ساتھ چہار دیواری تھی جو دور تک چلی گئی تھی۔ دروازے پر عربی زبان کے کلمات تحریر تھے اور ساتھ ہی ترکی زبان میں استنبول یونیورسٹی کھدا ہوا تھا۔ بغل کے چھوٹے سے داخلی دروازے سے اندر جانا چاہا تو سیکورٹی والوں نے راستہ روک لیا۔ وہ شاید جاننا چاہتے تھے کہ میں کس سے ملنے اور کس لیے اندر جانا چاہتا ہوں۔ لیکن زبانِ من ترکی نہ می دانم نہ تو دانم والا معاملہ ضرب المثل نہیں حقیقی تھا۔ میری بات ان کی سمجھ میں نہیں آئی تو انھوں نے اشارے سے ایک دوسرے دروازے کا راستہ بتایا۔ سیڑھیاں اترتے چڑھتے ہوئے سڑک پر دایاں موڑ کاٹ کر

دوسرے دروازے پر پہنچا تو وہاں بھی ایک گارڈ متعین تھا اور یہاں بھی زبانِ یارمن ترکی والا معاملہ درپیش تھا۔ مجھے سامنے ادبیات کا شعبہ نظر آرہا تھا، دروازے پر شعبوں کی جو فہرست تھی اس میں اردو کا شعبہ بھی موجود تھا۔لیکن گارڈ راستہ دینے پر تیار نہیں تھا۔ وہاں سے گزرنے والی ایک عورت نے مجھے مشکل میں دیکھ کر ترجمانی کا فریضہ سنبھال لیا۔گارڈ سے بات کر کے اس نے ٹوٹی پھوٹی انگریزی میں مجھے بتایا کہ یونیورسٹی بند ہے، اندر کوئی ڈیپارٹمنٹ نہیں کھلا، نہ کوئی تدریسی عملہ موجود ہے، میں چپ چاپ واپس گرینڈ بازار کی طرف آ گیا۔ مجھے حیرت تھی کہ ترکی جیسے آزاد ملک میں علم کے دروازوں پر اتنے کڑے پہرے کیوں ہیں۔

گرینڈ بازار میں دوبارہ داخل ہونے سے پہلے ایک ریستوران کی تیسری منزل پر کھانے بیٹھا تو یہاں سے ایک اور بازار کا منظر دیکھا جو تپلی گلی کی طرح حدِ نظر تک چلتا چلا گیا تھا۔ دونوں طرف چھوٹی چھوٹی دکانیں تھیں۔ یہ بند نہیں کھلا بازار تھا۔اور جگہ جگہ کینوس کی چھتیں تنی تھیں جو ہوا کے ساتھ جھولا جھول رہی تھیں۔شکم پُر کر کے ایک بار پھر گرینڈ بازار میں داخل ہوا۔ بازار کے اندر بازار در بازار تھے، کوئی احتیاط کام نہیں آئی اور ایک بار پھر قالین والوں کے ہاتھوں پکڑا گیا اور اس بار ایک قانون ہاتھوں میں لیے باہر نکلا۔ میں نے ایک قالین کی قیمت لگا دی تھی اور باہر چلا آیا تھا۔دکان دار کے ایک ملازم نے مجھے بازار کی پیچ دار گلیوں میں بھی ڈھونڈ نکالا اور میری لگائی ہوئی قیمت پر قالین میرے حوالے کیا۔

قالین کا تھیلا لٹکائے ہوٹل واپس آیا تو شام ہو رہی تھی۔کوئی پیغام نہیں تھا، نہ ریسپشن پر اور نہ انٹرنیٹ پر۔ میں نے سوچا شام کمرے میں گزاروں گا، نشاط شاید شام گئے آ جائے۔لیکن کمرے میں لیٹے لیٹے کمر اور ٹی وی دیکھتے دیکھتے آنکھیں تھک گئیں۔ایک بار فون کی گھنٹی بجی تو خوشی سے اچھل پڑا۔ شاید وہ آ گئی تھی۔ میرا خیال غلط تھا، فون ہوٹل کے عملے کا تھا جو ڈنر کے لیے میری میز مخصوص کرنا چاہتے تھے۔ میں نے منع کر دیا۔ مجھے کھلی ہوا میں کھانا تھا۔

آرام کرتے کرتے تھک گیا تو رات گئے باہر نکلا۔سڑک کے ایک طرف ریستورانوں کی قطار تھی۔ کبابوں کی خوشبو اشتہا بڑھا رہی تھی۔ میں بھی ایک ریستوران کے سامنے فٹ پاتھ پر لگی میز کرسی پر بیٹھ گیا اور ترکی کے کباب منگوا کر ان سے انصاف کرنے لگا۔سامنے ہی لال ترکی ٹوپی اور اسی رنگ کی واسکٹ پہنے ایک لڑکا آئس کریم پارلر کے پیچھے کھڑا لوہے کی ایک لمبی سلاخ سے آئس کریم نکالنے اور

لیٹنے کے کرتب دکھا رہا تھا۔ رستہ چلتے سیاح رک کر اس کے ساتھ تصویر کھنچواتے اور آگے بڑھ جاتے۔

کمرے میں آتے آتے بارہ بج گئے تھے۔ بستر آغوش میں لینے کے لیے تیار تھا۔ رات بھر خواب میں نشاط کے ساتھ گرینڈ بازار میں گھومتا رہا، لیکن اس طرح کے پورے بازار میں صرف ہم دو خریدار تھے۔ میں نے بازار کی سب دکانوں سے قالین خرید کر رستے میں بچھوا دیے تھے جن پر نشاط کسی ملکہ کی طرح چل رہی تھی۔ جیولری کی ہر دکان کے باہر جوہری زیورات نچھاور کر رہے تھے۔ نشاط کے کان، اس کی ناک، گردن، انگلیاں اور کلائیاں ہیرے، موتیوں اور سونے چاندی سے لد گئی تھیں۔ بازار سے ہم دونوں باہر نکلے تھے تو سب کچھ بدل گیا تھا۔ نشاط غائب ہو گئی تھی، ساتھ ہی سب گنبد، دروازے، محرابیں اور روشیں بھی۔ چاروں طرف سمندر پھیلا تھا اور میں آہستہ آہستہ اس میں ڈوب رہا تھا۔ حلق خشک ہو گیا تھا۔ میں سارا سمندر پی گیا پھر بھی پیاس نہیں بجھ سکی تھی۔ آنکھ کھل گئی تو دیر تک کمرے کے اندھیرے کو تکتا رہا۔ کافی دیر بعد حقیقتوں کے دھندلے نقش و نگار واضح ہونا شروع ہوئے۔ پیاس شدید تھی۔ دو گلاس پانی پی گیا، وقت دیکھا تو صبح کے صرف چھ بجے تھے۔ کروٹیں لیتا رہا لیکن نیند سے لڑنے کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔

ناشتے کے لیے ٹیرس پر پہنچا تو خیال تھا کہ آج سب سے پہلے پہنچنے کا ریکارڈ قائم کروں گا۔ ابھی صرف آٹھ بجے تھے لیکن کوئی ناشتہ کر کے جا بھی چکا تھا۔ کچھ پرندے میز پر بیٹھے بچے کھچے ٹوسٹ کے ٹکڑوں پر چونچیں مار رہے تھے۔ میں نے قریب کی میز کھسکائی تو ڈر کر اڑ گئے اور سامنے ایک چھوٹی سی مسجد کے گنبد پر دھوپ تاپتے کبوتروں کے غول میں شامل ہو گئے۔ ہوٹل کے دوسرے مہمان بھی ناشتے کے لیے آنے لگے تھے۔ سب جوڑوں کی شکل میں تھے، مجھے تنہائی کا شدّت سے احساس ہوا۔

نشاط اگر کل آ گئی ہوتی تو آج کم از کم ناشتے پر ساتھ ہوتی۔ رات کو میرے کمرے میں میرے بستر پر سوتی۔ نیویارک کے زمانے میں ایک بار پہلے بھی سو چکی تھی۔ جانے کہاں سے تھکی ماندی آئی تھی۔ اس رات اس کے پاس سونے کی جگہ نہیں تھی۔ میرے پاس ایک کمرہ اور کمرے میں صرف ایک بستر تھا، لیکن اسے پروا نہیں تھی۔ وہ دیر تک اپنے دن بھر کے کارنامے سناتی رہی اور پھر لیٹ کر دوسری طرف کروٹ لی اور آنکھیں بند کر لیں۔ میں مخالف سمت میں کروٹ لیے اندھیرے میں پلکیں جھپکاتا رہا۔ اس کی طرف کروٹ بدل کر پیش دستی کرنے کی ہمت آتی اور پھر چلی جاتی۔ میں شاید اس کی دیوانگی

سے خوف زدہ تھا۔اثبات یا انکار دونوں صورتیں خطرناک تھیں۔ مجھے اپنی چیر پھاڑ سے ڈر لگتا تھا۔لیکن اب تو ایک زمانہ گزر گیا تھا اس میں اب ٹھہراؤ آ گیا ہوگا۔شاید......

نیچے لابی میں کمپیوٹر پر ایک سیاح لڑکی بیٹھی کی بورڈ پر انگلیوں سے ٹھک ٹھک کر رہی تھیں۔ میں لابی میں رکھے ہوئے اخبار الٹ پلٹ کرتا رہا۔آج کے اخبار کی سب خبریں بھی ایسی ہی تھیں۔جیسی کل کے اخبار کی، یا اس سے ایک دن، ایک ہفتہ، ایک مہینہ یا ایک سال پہلے کی۔عراق، افغانستان یا پاکستان میں میزائل یا خودکش دھماکہ۔اور اس پر امریکی سفیر، جنرل یا صدر کا بیان۔فلسطین میں اسرائیل کی دہشت گردی اور امریکی دعوے۔عالمی کساد بازاری اور امریکی اقدامات۔ ہر عالمی واقعہ کا محور و منبع امریکہ تھا۔ میں نے بے زاری سے اخبارات میز پر پٹخ دیے۔سامنے کی دیوار پر بنے ہوئے تیر ترکی کے حمام کا راستہ دکھا رہے تھے۔ترکی کے مشہور حمام میں غسل کرنے کے خیال سے ہی پھریریاں آنے لگیں۔استقبال پر بیٹھی ہوئی لڑکی سے بھاؤ پوچھ کر بکنگ کرانے ہی والا تھا کہ احتیاطاً غسل کرانے والی عورتوں کے بارے میں پوچھ لیا۔''عورتیں؟''اس نے حیرت سے کہا اور پھر ہنس پڑی۔''غسل کرانے والی عورتیں نہیں مرد ہیں۔آپ کو عورتوں سے غسل لینا ہے تو ہوٹل سے نکل کر دائیں ہاتھ ہولیں۔سو میٹر کے بعد جو گلی آئے گی اس میں مڑ جائیں تو سامنے تھائی مساج کا بورڈ نظر آ جائے گا۔وہاں تھائی لڑکیاں آپ کو......''

''نہیں!نہیں!!''میں نے اسے مزید تفصیل میں جانے سے روک دیا۔''تھائی مساج میں تھائی لینڈ جا کر کراؤں گا۔''میرے ساتھ وہ بھی ہنس پڑی۔

اسی وقت کمپیوٹر کے سامنے بیٹھی ہوئی لڑکی اٹھنے کے لیے اپنا بیگ سنبھالنے لگی تھی۔ میں نے اس کی جگہ لینے میں دیر نہیں کی۔اپنے پیغامات تو پہنچا تو روشنیاں چھم چھم کرنے لگیں اور ساتھ ہی وہ مانوس سی خوشبو!نشاط کا پیغام موجود تھا۔لیکن اتنا طویل اور تفصیلی؟ ہمیں تو مل کر باتیں کرنا تھیں، بے تحاشا، طویل اور تفصیلی!ملنا تھا تو پھر برقی مراسلت کی طوالت کیوں؟

اس نے استنبول نہ آنے کی معذرت کی تھی۔اسے اچانک کسی مظاہرے میں شریک ہونے اٹلی جانا پڑا تھا، اس لیے استنبول نہیں آسکی تھی اور اب آنا بھی نہیں چاہتی تھی۔ میں نے اخبار میں اٹلی میں ہونے والے بیس بڑوں کے اجلاس اور اس کے خلاف ہونے والے مظاہروں کے بارے میں پڑھا

تھا۔ٹی وی کی خبروں میں پولیس کی سختیاں دیکھی تھیں ۔ مجھے یقین تھا کہ نشاط اس مظاہرے میں سب سے آگے رہی ہوگی۔اس نے نیویارک کا برسوں پرانا منظر اٹلی میں بھی دہرایا ہوگا۔ فلسطینی رنگوں والا پرانا اسکارف گلے سے اتار کر اپنے سر کے گرد لپیٹا ہوگا، گھٹنوں سے پھٹی ہوئی جینز کے اندر قمیص کسی ہو گی،ٹینس کے میلے جوتوں کے تسمے مضبوطی سے باندھے ہوں گے اور مُکا لہرا کر نعرہ لگاتی ہوئی پولیس کی صف بندی سے ٹکرا گئی ہوگی ۔ مجھے یقین تھا پہلی لاٹھی بھی اسی نے کھائی ہوگی، پولیس نے بال پکڑ کر سب سے پہلے اسی کو گھسیٹا ہوگا اور سب سے پہلے اسی کو گرفتار کر کے وین میں ٹھونسا ہوگا۔

مجھے حیرت تھی کہ نشاط اب تک وہی نیویارک والی نشاط تھی ۔نوجوانی کے اُس دور میں یہ سب کچھ میں نے بھی کیا تھا۔اپنے پھیپھڑوں اور حلق کی پوری طاقت سے نعرے لگائے تھے، پولیس کی لاٹھیاں کھائی تھیں اور تھانوں کے لاک اپ میں بھی وقت گزارا تھا۔ بہت سے خواب دیکھے تھے اور جان ہتھیلی پے رکھ کر ان خوابوں کی تعبیر بھی ڈھونڈی تھی ۔کئی بار ایسا لگا تھا کہ انقلاب سامنے کھڑا ہے۔لیکن سرابوں کے پیچھے بھٹکنے کی عمر ختم ہوئی تو پھر کیریر بنانے اور شان بڑھانے کی جستجو نے آلیا تھا۔زندگی ہر دور میں ایک نیا کردار متعیّن کر دیتی ہے۔لیکن نشاط کو کیریر اور شان بنانے یا بڑھانے سے کوئی دلچسپی نہیں تھی ۔اس نے برسوں پہلے اپنے لیے جو کردار متعیّن کیا تھا، ابھی تک اسی پر مانع تھی ۔ دل اس کا دفاع کرنے لگا......اگر نشاط جیسے لوگ نہ رہیں تو دنیا روبوٹ بنانے والا کارخانہ اور انسان محض منافع بنانے والی بھٹیوں کا ایندھن ہو کر رہ جائے۔

نشاط نے لکھا تھا وہ بہت تھک گئی ہے۔اب وہ سیدھی اپنے آبائی شہر کیش جائے گی اور بحرِ اوسط کے گہرے نیلے شفاف پانی میں تیر کر سکون حاصل کرے گی ۔ مجھے معلوم تھا وہ زیادہ دیر آرام نہیں کر پائے گی۔کہیں سے مظاہرے کی خبر آئے گی، اس کا نیٹ ورک اس کے کرائے کے لیے چندہ جمع کرے گا اور کرایہ ملتے ہی وہ اپنا تھیلا کندھے پر لٹکائے گی اور چل پڑے گی۔

نشاط نے مجھے بھی کیش آنے کی دعوت دی تھی ۔اس نے لکھا تھا ''استنبول میں دیکھنے کے لیے جو کچھ ہے وہ تم اب تک دیکھ چکے ہوگے ۔عمارتوں کے گنبد، مسجدوں کے مینار، قالینوں اور جواہرات والے بازار۔ تمھیں کوئی نہ کوئی اب تک قالین بھی بیچ چکا ہوگا۔ میں جانتی ہوں تمھاری قوتِ انکار بہت کمزور ہے۔اسی لیے دنیا کی نمائشی چکاچوند سے خود کو نہ بچا سکے اور کیریر بنانے میں لگ گئے ۔تم نے اچھا

کیا تھا ورنہ میری طرح نہ اِدھر کے رہتے نہ اُدھر کے۔ انقلاب کی جستجو بہت بھٹکاتی ہے، اور بھٹکنے کے لیے مضبوط ٹانگوں کے ساتھ مضبوط ارادوں کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔

''تم نے شاید استنبول کے عجائب گھر بھی دیکھ لیے ہوں گے۔ میں نے کبھی نہیں دیکھے۔ استنبول میرا آبائی شہر نہیں ہے، لیکن میں نے زندگی کا بیشتر حصہ یہیں گزارا ہے۔ اسکول، کالج، یونیورسٹی اور انقلاب کی پہلی چنگاری، وہ بھی یہیں بھڑکی تھی۔ لیکن میں ماضی کے حکمرانوں کی شان وشوکت کے مظاہر دیکھنے کبھی کسی عجائب گھر نہیں گئی۔ مجھے ان سارے سلطانوں، خلیفوں اور بادشاہوں کے چھوڑے ہوئے ہیروں اور جواہرات سے گھن آتی ہے۔ ان کی پوشاکوں اور کھانے کے برتنوں میں بھی جواہر جڑے تھے جبکہ ان کی رعایا پھٹے ہوئے کپڑے پہنے ٹوٹے برتنوں میں کھانا کھاتی تھی اور سخت زمینوں پر بیٹھ کر اپنے آقاؤں کے لیے گدیلے قالین بنتی تھی۔

''میں جب استنبول یونیورسٹی میں تھی تو میں نے یہ مہم شروع کی تھی کہ عجائب گھروں میں محفوظ ہیرے جواہرات بیچ کر غریبی ختم کی جائے۔ کم از کم ایک نسل کی غربت ختم کی جاسکتی تھی۔ لیکن میری مہم آگے نہ بڑھ سکی۔ میرے نظریاتی دوست بھی میرا ساتھ دینے پر تیار نہیں تھے۔ تُرک اپنے ماضی پر بہت فخر کرتے ہیں۔ ماضی کی مجاوری مجھے پسند نہیں ہے۔ تلوار کے زور پر پھیلنے والی سلطنت تادیر قائم نہیں رہتی اور بالآخر سکڑ کر اپنے دائرے میں واپس آجاتی ہے۔ صرف ترکی کی نہیں، دنیا کی ہر نوآبادیاتی طاقت کی یہی تاریخ ہے۔ ان کی شان وشوکت کے مظاہر صرف عجائب گھروں میں محفوظ رہتے ہیں۔

''میری مہم شاید چل بھی نکلتی لیکن اسی زمانے میں مجھے اسکالرشپ مل گیا اور میں ایم بی اے کرنے نیویارک چلی گئی۔ جہاں تم بھی نئے نئے آئے تھے۔ مجھے یاد ہے تم کتنے شرمیلے اور کم گو تھے۔ میں تمھارے چہرے پر آتے جاتے رنگوں سے تمھیں پڑھ سکتی تھی۔ لڑکیوں سے بات کرتے ہوئے تم سرخ ہوجاتے تھے۔ مجھ سے بات کرتے ہوئے کبھی سرخ نہیں ہوئے۔ میں اسی لیے تمھارے قریب آئی تھی کہ تم مجھے لڑکی نہیں، دوست سمجھتے تھے۔ (کیا میں تمھیں واقعی لڑکی نہیں لگی تھی؟)

''تم کیش ضرور آؤ۔ ہم پرانے وقتوں کو یاد کریں گے۔ میں تمھیں ہزاروں سال پرانی وہ تہذیب دکھاؤں گی جو کھنڈروں کی شکل میں آج بھی زمینوں پر یا زیرِ آب زندہ ہے۔ اس تہذیب میں ہیروں اور جواہرات کی چکاچوند یا بڑے بڑے نقشین گنبدوں کا جاہ وجلال نہیں ہے لیکن کیش میں تمھیں

تھیسٹر کے کھنڈرات ملیں گے جن میں آرٹ پروان چڑھتا تھا۔ہم اس کشتی میں سفر کریں گے جس کا فرش شیشے کا ہے اور جس سے تم جزیرہ کیکوا کے شہروں کے کھنڈرات دیکھ سکو گے۔ان شہروں کے کھنڈرات میں اونچے ستونوں والی راہ داریاں نہیں،صرف زینے اور پتھریلی دیواریں ہیں۔ہم کیش کے اطراف میں پھیلے ہوئے لیشیا تہذیب کے سیکڑوں سال پرانے کھنڈرات میں بھٹکیں گے جہاں آج بھی پراسرار سائے چکراتے ہیں،لیکن یہ آسیب تمھیں خوف زدہ نہیں کریں گے۔

''میرے پاس صرف تین دن ہیں جو میں تمھارے ساتھ کیش میں گزاروں گی۔پھر مجھے کوپن ہیگن جانا ہے جہاں ماحولیاتی کانفرنس ہو رہی ہے۔وہ سب وہاں ہوں گے جنھوں نے ہواؤں میں زہر گھول رکھا ہے اور جو برفانی تودوں کو پانی بنا کر بہا رہے ہیں۔ہم انھیں آئینہ دکھائیں گے۔تم آؤ تو کیش میں کسی بھی ٹیکسی ڈرائیور سے جنرل عثمان بے کا نام لینا،وہ تمھیں میرے گھر لے آئے گا۔ہوسکتا ہے بابا تم سے ملیں تو اچھا برتاؤ نہ کریں،لیکن برا نہ ماننا۔انھیں زمانہ سازی نہیں آتی،نہ وہ بناوٹی اخلاقیات پر رکھتے ہیں۔وہ جب بولتے ہیں تو ان کی دل شکستگی اور ان کے اندر کے زخمی شیر کی چنگھاڑ باہر آجاتی ہے۔

''بابا کو آج بھی اپنے اصیل سلجوقی ترک ہونے اور سپہ گری کی اپنی آبائی روایت پر بہت فخر ہے۔انھوں نے شادی بھی کسی ملاوٹی ترک سے نہیں بلکہ حسب نسب دیکھ کر کی تھی۔وہ اب ریٹائر ہو کر اناطالیہ کے اِس کنارے آبسے ہیں جہاں سے عثمانیہ سلطنت شروع ہوئی تھی۔یہاں کے ماحول اور پُرسکون سمندر نے انھیں میری ماں کی موت کا دکھ بھلانے میں بہت مدد کی ہے۔لیکن میری ماں کی موت سے زیادہ ان کی زندگی کے دو اور بڑے ملال ہیں جو آج بھی تازہ ہیں۔ایک ملال تو انہیں تاریخ نے دیا ہے۔سلطنتِ عثمانیہ کا زوال!سو سال پرانا یہ زخم ہوش سنبھالنے سے لے کر آج تک ان کے دل میں ناسور بن کر زندہ ہے۔ان کا دوسرا ملال میں ہوں۔میں ان کی اکلوتی اولاد تھی۔نجیب الطرفین ترک جسے انھوں نے بیٹے کی طرح بڑا کیا تھا۔ان کا خیال تھا کہ میں ان کے سلجوقی آباؤ اجداد کا نام روشن کروں گی لیکن میں تو کسی اور دنیا میں رہنے لگی۔میں نے کبھی ان کے لعن طعن کا برا نہیں مانا۔ان کی چنگھاڑ سن کر صرف ایک بار جواب دیا تھا کہ میں اپنے سلجوقی فاتحین کی پیروی کر رہی ہوں۔میں ترکی کی حدود میں بند رہنے کے بجائے یورپی اور امریکی آقاؤں سے عالم گیریت کے خلاف جنگ کر رہی ہوں،ماحولیات

کے لیے سام راج سے لڑ رہی ہوں۔ میں نے ان سے کہا کہ وہ میری فتح کے لیے دعا کریں تو وہ ہنس پڑے تھے۔ بہت زمانے بعد انھیں ہنستے ہوئے دیکھا تو بہت اچھا لگا تھا۔ اس کے بعد انھوں نے مجھے کبھی نہیں ڈانٹا، لیکن میں ان کی آنکھوں میں چھپا ہوا درد صاف دیکھ سکتی ہوں۔

''تمھیں یہ سب اس لیے بتا رہی ہوں کہ تم ان سے ملو تو ڈرنا مت۔ آنا ضرور! تمھاری نشاط۔''

کچھ دیر میں اسی طرح خاموش بیٹھا اسکرین کو تکتا رہا لیکن پھر ایک گہرا سانس لے کر اٹھ گیا۔ نشاط کے لیے استنبول آ گیا تھا تو اب کیش بھی سہی۔ اس کا مطلب تھا کہ استنبول کے لیے کم وقت بچا تھا اور توپ کاپی کا عجائب گھر دیکھنا ابھی باقی تھا۔ مجھے وہ دیکھنا ہی تھا، نشاط کی ہر بات سے اتفاق کرنا ضروری نہیں تھا۔ ہوٹل کے استقبالیہ پر بیٹھی ہوئی لڑکی نے باسفورس کا کروز لینے کی بھی پرزور سفارش کی تھی۔ وہاں بھی جایا جا سکتا تھا۔ آج کی رات باقی تھی۔ ہوٹل سے باہر نکلتے ہی سامنے ٹریول ایجنسی تھی۔ سب کچھ بہت آسانی سے طے پا گیا۔ دلمان جانے کے لیے ہوائی جہاز کی نشست، دلمان سے کیش تک کے لیے ٹیکسی اور پھر وہاں سمندر کے کنارے ایک موٹل کا کمرہ۔ نصف گھنٹے میں سب بندوبست ہو گیا۔ انٹرنیٹ کے زمانے کا یہی کمال تھا۔ سب کچھ انگلیوں کی جنبشوں کے زیرِ نگیں تھا۔ کل کی پرواز تھی اس لیے آج کے بچے ہوئے دن اور رات کا استعمال کرنا تھا۔ ہوٹل واپس آ کر میں نے باسفورس کا ڈنر کروز بک کیا اور باہر نکل کر تیزی سے توپ کاپی کی طرف چل پڑا۔

سلطنتِ عثمانیہ کے خلیفاؤں کا محل عجائب گھر بن کر شاہی دور کی عظمت اور شان و شوکت کی کہانیاں سنا رہا تھا۔ ٹکٹ لے کر عجائب گھر میں داخل ہوا اور روش روش ہوتا توپ کاپی کے مختلف حصوں میں رکھے ہوئے نوادرات دیکھتا اور حیران ہوتا رہا۔ شاہی استعمال کی ہر چیز میں ہیرے، جواہرات اور نگینے جڑے تھے۔ تخت و تاج، شمشیر و سناں، کھانے پینے کے ظروف، شاہی عبائیں اور لباس۔ وہ خنجر بھی دیکھا جس پر مشہور فلم توپ کاپی بنی تھی جس میں یہ قیمتی خنجر چرانے کی کہانی فلمائی گئی تھی۔

توپ کاپی کے نوادرات کی تفصیل سیاحتی کتابچوں میں اتنی بار پڑھی تھی پھر بھی آنکھیں خیرہ ہو رہی تھیں۔ لباس کے سیکشن میں شلوار جمپر کی طرح ایک نسوانی لباس دیکھا جو سولہویں صدی کا تھا۔ شمالی ہندوستان اور پاکستان میں جو شلوار قمیص رائج ہے یہ اس کی اوّلین شکل لگتی تھی۔ اس حصے میں آیا جہاں پینٹنگز بھی تھیں، وہاں ہر تصویر بادشاہوں سے موسوم تھی لیکن بیشتر پر انھیں بنانے والے مصوروں کے نام

نہیں، صرف ''نامعلوم'' تحریر تھا۔ دنیا کے کئی مشہور عجائب گھر اور گیلریز دیکھ چکا تھا جہاں تصویریں اپنے خالق کے نام سے پہچانی جاتی ہیں۔ سلطنتِ عثمانیہ کے نامعلوم مصور شاید بے قدری کا شکار رہے ہوں گے ورنہ اس زمانے میں اور اس سے بھی پہلے ترکی کے بالائی حصے سے ملے یورپ کے ممالک میں مصوروں کا بول بالا ہو رہا تھا۔ ترکی کے مصوروں کی تخلیقات ان کے ہم عصر یورپی مصوروں کی تخلیقات سے کم تر نہیں تھیں۔

توپ کاپی کے ریستوران میں کھانے کا مزا آیا۔ سامنے سمندر بچھا تھا، دور باسفورس کا پُل بھی نظر آ رہا تھا جو ایشیا اور یورپ کو باندھے رکھتا ہے۔ لنچ سے فارغ ہو کر عجائب گھر کا ایک اور حصہ دیکھا لیکن حرم دیکھنے کی ہمت نہیں ہوئی۔ جانے کیوں نشاط کے الفاظ دماغ میں چکرانے لگے تھے ''مجھے گھِن آتی ہے!''...... آج کچھ زیادہ ہی چلنا پڑا تھا، اب عادت نہیں رہی تھی، لگتا تھا رانوں کے پٹھے اکڑ گئے ہیں۔ پنڈلیاں درد کر رہی تھیں، شام کو ڈنر کروز پر بھی جانا تھا اس لیے آہستہ آہستہ چلتا ہوا ہوٹل واپس ہوا راستے میں صوفیہ آیا تھا۔ بزنطائن دور کا مشہور گرجا گھر جسے مسلمان بادشاہوں نے مسجد میں بدل دیا تھا لیکن پھر ایک منصف مزاج سلطان نے اسے عجائب گھر بنا کر اسلام اور عیسائیت کا جھگڑا ختم کر دیا تھا۔

شام ساڑھے سات بجے ڈنر کروز پر لے جانے کے لیے بس آ گئی۔ ہم نے استنبول کی مشغول سڑکوں سے گزر کر ایک پل عبور کیا اور میرینا پر جہاں لگژری بوٹس کی قطاریں لگی تھیں، اتار دیے گئے۔ ایک گائڈ نے بڑی سی بوٹ کے اوپری ڈیک تک ہماری رہنمائی کی جہاں کرسیاں اور گدیلی نشستیں لگی تھیں اور بیرے مشروبات سے تواضع کر رہے۔ ٹھنڈی ہوا شانوں کو کاٹنے لگی تھی۔ مجھے اپنے جیکٹ پہن کر نہ آنے کے فیصلہ پر افسوس ہوا۔ بیشتر لوگ میری طرح صرف قمیص یا ٹی شرٹ پہنے ہوئے تھے۔ اکثر خواتین بھی مہین بلاؤز پہنے ہوئے تھیں، یا ایسا لباس جس میں ان کی بانہیں ننگی تھیں، ٹھنڈی ہوا سب کو کاٹ رہی تھیں۔ باہر سڑک کے کنارے ایک شخص شالیں بیچ رہا تھا۔ ایک خاتون تیزی سے اتریں اور ایک شال خرید لائیں۔ مجھ سمیت سب نے ان کی پیروی کی۔ سب شالیں بک چکیں تو بوٹ چل پڑی۔

کچھ دیر بعد ہی ہمیں نچلے ڈیک پر جانے کی دعوت ملی جہاں کھانے کی میزیں لگی تھیں۔ چاروں طرف شیشے کی بند کھڑکیاں تھیں اس لیے ہوا کا گزر نہیں تھا۔ نئی خریدی ہوئی شالیں کندھوں سے اتریں اور لپیٹ کر رکھ دی گئیں۔ بوٹ بھری ہوئی تھی، کوئی دو ڈھائی سو لوگ ہوں گے۔ ایک ایک میز پر دس دس

لوگ تھے۔ ہماری میز پر میرے علاوہ ایک ایرانی خاندان تھا، دو جوڑے اور ان کی دو خوب صورت بیٹیاں۔ لباس کی تراش خراش اور بننے سنورنے کے انداز نے ایرانی حسن دوبالا کر دیا تھا۔ کھانے کے دوران سرخ انگوری شراب فراخ دلی سے پیش کی جا رہی تھی۔ ایرانی گروپ کی عورتیں اور مرد دونوں پورا انصاف کر رہے تھے۔

بحرِ مرمر میں رواں سفینہ آہستہ آہستہ آگے بڑھ رہا تھا۔ سمندر کے دونوں کناروں کی روشنیاں رات کی تاریکی میں چھم چھم کرتی نظر آ رہی تھیں۔ ہم باسفورس برج کے قریب پہنچ رہے تھے جو فیروزی روشنیوں سے چمکتا ہوا بہت دل فریب لگ رہا تھا۔ واپسی کے سفر میں پل کی روشنیوں کا رنگ بدل کر سرخ ہو گیا تھا۔ ترکی کے لوگ رنگوں کے بارے میں واقعی خوش مزاج تھے۔ باہر کے مناظر نگاہوں میں جذب کرتے ہوئے میں نے برابر میں بیٹھی ایرانی عورت سے بات چیت کی ڈور کھینچنا چاہی لیکن بات ابتدائی تعارف سے آگے نہیں بڑھی۔ میں سوچ رہا تھا کہ کون کہتا ہے کہ ایران میں رہنے والے ملائیت کا شکار ہو گئے ہیں۔ میرے دوسری جانب بیٹھا ہوا ایرانی شخص میری طرف متوجہ نہیں تھا اس لیے میں اپنی پلیٹ میں رکھی ہوئی سالم مچھلی سے انصاف کرنے لگا۔

کھانا ختم ہوا تو اوپری ڈیک پر واپس جانے کی نوید ملی جہاں ثقافتی پروگرام کا اہتمام تھا۔ میٹھے اور اس کے بعد کافی کا بھی وہیں انتظام تھا۔ ہوا اب بھی خنک تھی لیکن کاٹ نہیں رہی تھی۔ کسی نے اپنی نئی شال نکال کر نہیں اوڑھی۔ ایک باکمال رقاصہ بیلی ڈانس کا مظاہرہ کر رہی تھی۔ اس نے اپنے ساتھ کئی مہمانوں کو بھی رقص کرایا۔ ایک ثقافتی طائفے نے ترک شادی کی رسوم پیش کیں۔ دولہا دلہن بنے رقاص نے اپنے دوستوں اور سہیلیوں کے ساتھ مختلف طرح کے رقص کیے۔ رقص میں شرکت کی عام دعوت تھی جس کا فائدہ کئی مہمانوں نے اٹھایا۔ ثقافتی شو ختم ہوتے ہی ڈسکو کے لیے موسیقی شروع ہو گئی۔ مہمانوں کی بڑی تعداد محوِ رقص تھی۔ ترکی کے فن کار بھی کپڑے بدل کر آ گئے اور رقص کے دوران اب اپنے ساتھی بدل رہے تھے۔ ایرانی گروپ کے سب چھوٹے بڑے پُر جوش طریقے سے رقص میں شریک تھے اور ہم تھے کہ تماشا دیکھا کیے۔

رات کے تقریباً بارہ بجے سفینہ واپس پہنچ کر لنگر انداز ہوا۔ ہوٹل آتے آتے ایک گھنٹہ اور گزر گیا۔ تھکن، خمار، کیش جانے کی بے قراری اور نشاط سے ملنے کا کیف آگیں تصور، ان سب نے مل کر

فوراً ہی نیند کی آغوش میں پہنچا دیا۔ میں رات بھر نشاط کے ساتھ لیشیا کی پرانی تہذیب اوڑھے کھنڈروں میں بھٹکتا رہا۔ پھر جانے کیسے ہم ایک مقبرے میں دفن ہو گئے تھے جہاں سے گھنٹی کی شکل کی پروں والی مخلوق ہمیں نکال کر سمندر در سمندر اڑائے لیے جا رہی تھی۔ ہم نہیں شاید ہماری روحیں پرواز کر رہی تھیں۔

استنبول سے دلمان کی پرواز صرف ڈیڑھ گھنٹے کی تھی۔ ترکش ایئر لائنز کے بہت مستعد عملے نے اس مختصر وقت میں ہمیں کھانا دیا اور چائے کافی سے بھی تواضع کی۔ دل مان ایئر پورٹ کے باہر کیش لے جانے کے لیے ڈرائیور موجود تھا۔ گاڑی چھوٹے چھوٹے شہروں سے گزرتی رہی اور پھر پہاڑ کی پیچ دار سڑک پر آ گئی۔ بائیں طرف اونچا سا پہاڑ اور دائیں جانب نیچے کی طرف دور تک پھیلا ہوا سمندر۔ سورج کا بڑا سا نارنجی گولا سمندر میں ڈوب رہا تھا۔ چلتے چلتے رات ہو گئی تھی اور تھکن غالب آ رہی تھیں۔ تین گھنٹے سے زیادہ ہو گئے تھے، بیٹھے بیٹھے کمر دکھنے لگی تھی۔ پہاڑی سڑک کا موڑ کاٹتے ہوئے دور سامنے کسی بستی کی روشنیاں ٹمٹماتی نظر آتیں تو لگتا منزل آ گئی ہے، لیکن گاڑی موڑ کاٹتی ہوئی آگے نکل جاتی اور سامنے سڑک پر روشنی کی دو سیدھی لکیریں اندھیرے سے لڑتی رہتیں۔ دائیں جانب تاریکی میں ڈوبا ہوا پر سکون سمندر تھا اور بائیں جانب پہاڑوں پر چھایا ہوا پراسرار سناٹا۔ چاندنی رات بھی نہیں تھی ورنہ سمندر میں ہلکورے لیتے ہوئے چاند کا رقص تھکنے نہیں دیتا۔

اس بار جب ایک بستی کی روشنیاں نظر آئیں تو ڈرائیور کے چہرے پر بھی ان کا عکس نظر آیا۔ انگریزی سے نابلد ڈرائیور نے سامنے اشارہ کر کے کیش کا نعرہ بلند کیا تو میری تھکن بھی اتر گئی۔ گاڑی بستی کے اندر داخل نہیں ہوئی تھی بلکہ ایک پتلی سی کچی سڑک پر آ گئی تھی جس کے دائیں جانب بڑی بڑی حویلیاں تھیں جو پہاڑ کی اترائیوں میں دور سمندر تک چلی گئی تھیں۔ ایسے ہی ایک مکان کے سامنے گاڑی رکی تو ڈرائیور نے دروازہ کھول کر اترنے کا اشارہ کیا۔ مجھے حیرت ہوئی۔ مکان شاندار تھا لیکن ہوٹل جیسا حلیہ نہیں تھا۔ ہوٹل کا کوئی بورڈ بھی نہیں لگا تھا۔ اسی وقت اندر سے ایک خادم نکل کر آیا اور ڈرائیور کو فارغ کر کے مجھے اور میرا سامان اندر لے آیا۔ بہت کشادہ ڈرائنگ روم تھا جس میں آرام دہ صوفے اور کرسیاں پڑی تھیں۔ ساتھ ہی باورچی خانہ اور بڑی سی کھانے کی میز تھی۔ درمیان سے چمک دار لکڑی کی چوڑی سیڑھیاں پہلی منزل تک رہنمائی کر رہی تھیں، جہاں کمرے تھے۔ میرا کمرہ اور اس

سے متصل غسل خانہ بھی بہت کشادہ تھا۔ خادم نے بتایا کہ باقی تینوں کمرے خالی تھے اور میرے علاوہ کوئی اور مقیم نہیں تھا۔

میں کھانے کی رسم پوری کر کے خواب بیچ کر ایسا سویا کہ طلوع آفتاب کا منظر دیکھنے نہ اٹھ سکا۔ ملازم اٹھانا بھول گیا تھا یا شاید میں اٹھ نہیں سکا تھا۔ اتر کر نیچے آیا تو شیشے کا بڑا دروازہ مکان کے عقب میں کھلتا تھا جس سے میں کمرے کے سامنے پھیلا ہوا سمندر دیکھ سکتا تھا۔ دوسرے کنارے پر ایک اور پہاڑی سلسلہ نظر آ رہا تھا۔ ملازم نے اشارے سے بتایا کہ وہ یونانی جزیرہ ہے اور اگر میرے پاس وقت اور ویزے کی سہولت ہو تو میں بوٹ کے ذریعے وہاں جا سکتا ہوں۔ میں اسے اب کس طرح سمجھاتا کہ میں یہاں سیاحت کرنے نہیں آیا۔ اس نے عقبی دروازہ کھول کر نیچے اترنے والی پتھریلی سیڑھیوں تک میری رہنمائی کی۔ سیڑھیاں ایک چھوٹی سی مسطح چٹان پر ختم ہو رہی تھیں جس سے پانی کی موجیں آ کر اپنا سر ٹکرا رہی تھیں۔ میں پانی میں پاؤں ڈال کر بیٹھ گیا۔ بحر اوسط کے پانی کی خنکی پیروں کے ذریعے جسم میں داخل ہو کر گدگدیاں کر رہی تھی۔ چٹانوں کے چھوٹے چھوٹے سوراخوں سے ہوا سنسناتی ہوئی نکل رہی تھی۔ جیسے بھوت سانس لے رہے ہوں۔ مجھے پھریری سی آ گئی۔ بھوتوں کی طرف خیال بھٹکانے کے لیے میں نے پانی میں زور زور سے ٹانگیں چلانی شروع کیں۔ نیچے دیکھا تو سینکڑوں چھوٹی چھوٹی مچھلیوں کا ایک غول بے چین ہو کر قلابازیاں کھانے لگا تھا۔ مجھے لگا یہ مچھلیاں میرے پیروں کا سارا گوشت نوچ لیں گی اور پانی میں میری ٹانگوں کا استخوانی ڈھانچہ لٹکا رہ جائے گا۔ میں نے فوراً ہی اپنے پیر پانی سے نکال لیے اور واپسی کے لیے مڑ گیا۔

میرے پاس وقت بھی کم تھا کچھ نشاط سے ملنے کی بے تابی بھی تھی۔ ہمارے پاس صرف تین دن تھے جس کے بعد نشاط مظاہرے میں حصہ لینے کوپن ہیگن چلی جاتی اور میں لندن۔ نشاط سے جانے پھر کب ملاقات ہو، اور ہو بھی یا نہیں۔ مجھے ان تین دنوں کا ہر لمحہ اس کے ساتھ گزارنا تھا۔ مجھے دیکھنا تھا وہ مجھے کن کھنڈروں اور کن پانیوں کی سیر کراتی ہے۔ مجھے اس کے ساتھ ہر جگہ بھٹکنا منظور تھا۔

ملازم نے میرے لیے دن بھر کی ٹیکسی کا بندوبست کر دیا تھا۔ نشاط نے غلط نہیں کہا تھا۔ ڈرائیور جنرل عثمان بے کا گھر جانتا تھا۔ نام سنتے ہی اس نے بہت احترام سے گردن خم کی تھی۔ دس منٹ کا فاصلہ تھا۔ نشاط کا مکان اسی پہاڑی کی اترائی میں تھا اور اُس مکان سے زیادہ شاندار تھا جہاں میں ٹھہرا ہوا

تھا۔ مکان کے مرکزی دروازے پر کم از کم چھ انچ گولائی کی بڑی سی نیلی آنکھ لگی تھی جو ترکی کی شناخت تھی۔ دروازہ ایک ملازم نے کھولا تھا۔ میں نے اسے بتایا کہ مجھے نشاط سے ملنا ہے تو وہ مجھے حیرت سے دیکھتا رہا۔ شاید اس کی سمجھ میں نہیں آیا تھا۔ وہ مجھے اندر آنے کا اشارہ کرنے لگا۔ میں اس کے پیچھے خاموشی سے چلتا ہوا استقبالیہ کمرے میں داخل ہوا۔ بہت کشادہ اور سجا ہوا کمرہ تھا۔ دیوار، پر ایک ٹرک جنرل کی کسی مصّور کی بنائی ہوئی قدِ آدم تصویر تھی۔ شاید نشاط کے آباؤ اجداد میں سے کسی کی ہوگی۔ فریم کیا ہوا ایک بڑا سا نقشہ بھی دیوار پر آویزاں تھا۔ مجھے یقین تھا اس نقشے میں کھنچی ہوئی لکیروں میں سلطنتِ عثمانیہ کے عروج کی کہانی لکھی ہوگی۔ دیواروں پر جا بجا قدیم زمانے کی تلواریں، ڈھالیں اور بندوقیں لگی تھیں۔ جنرل شاید اب بھی ماضی میں زندہ تھا۔

وہ جھولنے والی ایک آرام دہ کرسی پر بیٹھا تھا۔ اس کی پیٹھ اس جانب تھی جہاں سمندر تھا۔ مجھے یقین تھا کہ وہ جنرل عثمان بے تھا۔ نشاط کا باپ۔ میرے ذہن میں اس کا جو خاکہ تھا وہ اس سے مطابقت رکھتا تھا۔ اس کا چہرہ سرخ و سفید تھا اور چہرے کے عضلات تنے ہوئے۔ کوتاہ گردن اور بھاری جبڑا طبیعت کی سخت گیری ظاہر کر رہا تھا۔ سر پر پورے بال تھے لیکن سفید۔ گھنی بھویں اور مونچھیں بھی سفید تھیں۔ اس کے جسم پر گہرے نیلے رنگ کا گاؤن لپٹا ہوا تھا۔ ہاتھوں میں اخبار اور دانتوں میں سگار تھا۔ تپائی پر کافی کی چھوٹی سی پیالی رکھی تھی۔ اس نے نظر اٹھا کر مجھے دیکھا، سر کے خفیف اشارے سے میرے سلام کا جواب دیا لیکن وہ میرا خیر مقدم کرنے نہیں اٹھا۔ میرا خیال تھا مجھے جنرل کا سامنا نہیں کرنا پڑے گا۔ میں باہر سے ہی نشاط کو بلاؤں گا اور ساتھ لے کر چلا جاؤں گا۔ لیکن اب شیر کے سامنے آ گیا تھا تو مدّعا بھی بیان کرنا تھا۔

''میں نشاط کا دوست ہوں، اس سے ملنے آیا ہوں، براہِ کرم اسے ملوا دیجیے۔'' میں نے اپنی ہمتیں جمع کر کے کہا۔ ''کل میری اس سے ای میل پر بات ہوئی تھی۔ اس نے کہا تھا......''

جنرل کے چہرے کے تاثرات اچانک ہی بدلے تھے۔ آنکھوں میں سختی پہلے بھی تھی، لیکن اداسی بھی جھلکتی تھی۔ اداسی اور سختی دونوں اچانک ہی گہری ہو گئی تھیں۔ چہرہ غضب ناک ہو گیا تھا۔ ماتھے کے بل بھی گہرے ہو گئے تھے۔ میں اپنا جملہ مکمل نہیں کر سکا۔ اس نے بھی مجھ سے کچھ نہیں کہا بس نظریں پھیر کر اپنے ملازم سے کچھ کہا تھا۔ ایسا لگتا تھا اسے سزائے موت کا حکم سنا رہا ہو۔ ملازم نے مجھے باہر چلنے

کا اشارہ کیا، لیکن میں نے جنبش نہیں کی۔ میں نشاط سے ملے بغیر نہیں جا سکتا تھا۔ مجھے کھڑا دیکھ کر اسے مخاطب ہونا پڑا، لیکن اس طرح کہ نظریں اخبار پر جمی تھیں۔

''تمھارے ڈرائیور کو پتا ہوگا کہ نشاط کہاں ہے۔ میرا ملازم اسے بتا دے گا۔'' میں ملازم کے پیچھے باہر نکل آیا۔ ملازم نے ڈرائیور سے کچھ کہا تھا جو اثبات میں سر ہلا رہا تھا۔ اس بار سفر دس منٹ کا نہیں بلکہ زیادہ تھا۔ بڑے مکانوں کا سلسلہ ختم ہو گیا تھا۔ مجھے غصہ آ رہا تھا کہ یہ کیسا باپ ہے جو بیٹی کو گھر میں برداشت نہیں کر سکتا۔ جانے کس کھولی میں کس کے ساتھ رہ رہی ہوگی۔ مجھے معلوم تھا کہ نشاط کو عادت ہے لیکن پھر بھی، جب اس کا اپنا گھر یہاں ہو!

گاڑی ویران سڑک پر چل رہی تھی۔ دائیں جانب قبرستان تھا۔ کوئی باقاعدہ چہار دیواری نہیں تھی۔ لیکن قبروں کا سلسلہ شروع ہو گیا تھا۔ تھوڑی دیر بعد ڈرائیور نے گاڑی کچے میں اتار کر روک دی اور مجھے بھی اترنے کا اشارہ کرنے لگا۔ قبرستان سے گزرتے ہوئے فاتحہ پڑھنا شاید ان کا عقیدہ تھا۔ لیکن اس وقت یہ رسم مجھے اچھی نہیں لگی۔ مجھے فوری نشاط کے پاس پہنچنا تھا اور وہ جگہ نہ جانے ابھی کتنی دور تھی۔ ڈرائیور قبریں پھلانگتا ہوا ایک قبر کے پاس رکا جو آس پاس کی قبروں کے مقابلے میں نمایاں تھی۔ اس پر پھولوں کے پودے لگے تھے جن کی خوشبو مسحور کن تھی۔ جانے کیوں مجھے وہ خوشبو مانوس سی لگی۔ ڈرائیور نے قبر کی طرف اشارہ کیا اور ہاتھ اٹھا کر فاتحہ پڑھنے لگا۔ میں بھی اس کی تقلید میں ہاتھ اٹھا کر منہ ہی منہ میں کچھ بدبدانے لگا۔ نظریں اِدھر اُدھر بھٹک رہی تھیں، لیکن جب نگاہ قبر کے کتبے پر ٹھہری تو میرے ہاتھ نیچے گر گئے، دماغ میں پہلے تو چھک چھک کرتی بہت سی ٹرینیں ایک دوسرے سے ٹکرائیں اور پھر ایک بھیانک خلا، سوچیں تاریک ہو گئی تھیں۔ قبر کے سرہانے لگے کتبے پر نشاط کا نام اور دو سال پہلے کی تاریخِ وفات درج تھی۔

ناولوں سے اقتباسات

فینٹسی

ساتویں اور آخری خواہش کے خدوخال واضح ہونے شروع ہو گئے تھے۔ جن ایک دن صبح ہی صبح بن بلائے آ گیا تھا۔ وہ مجھ پر دباؤ ڈالنے آیا تھا کہ میں جلدی سے اپنی آخری خواہش بیان کر کے اس کی آزادی کا سامان کروں۔ وہ اپنی جنوں کی دنیا میں واپس جانا چاہتا تھا۔ کہتا تھا کہ انسانوں کا کمینہ پن دیکھ دیکھ کر وہ بہت بور ہو گیا ہے اور ڈرتا ہے کہ اس کی عادتیں بھی خراب نہ ہو جائیں۔ میں نے اسے ڈانٹ دیا۔ میں نے اسے بتایا کہ معاہدے کے مطابق میرے پاس ابھی ایک ہفتہ اور باقی ہے، اس لیے اب وہ اس وقت تک نہ آئے جب تک میں خود اسے طلب نہ کروں۔ اس نے بڑی سعادت مندی سے اپنا سر ہلایا اور ''یس باس'' کہتا ہوا دھوئیں میں بیٹھ کر اڑ گیا۔

میں نے اسے وقت ختم ہونے سے ایک روز پہلے رات کے وقت طلب کیا۔ میں بھی شاید اذیت پسند ہو گیا تھا۔ میں چاہتا تو صبح بھی بلا سکتا تھا۔ لیکن یہ آخری موقع تھا جب میں اسے بے آرام کر سکتا تھا۔ وہ آیا تو اس کے ماتھے پر بل نہیں بلکہ ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی۔ اس نے مجھے بتایا کہ وہ سویا نہیں تھا تیار بیٹھا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ آج میں اسے رات گئے بلاؤں گا۔ وہ میری نفسیات جان گیا تھا۔ آج اس نے ''یس باس'' نہیں بلکہ لیپ ٹاپ کھول کر ''کیا حکم ہے میرے آقا'' کا نعرہ لگایا۔ مجھے ایسا لگا کہ وہ میرا مذاق اڑا رہا تھا۔ میں نے اس سے اپنی خواہش بیان کی تو وہ ضد پر اتر آیا۔ کہنے لگا کہ اس خواہش

پر عمل درآمد ممکن نہیں ہے۔ مجھے حیرت ہوئی۔ وہ ایٹم بم جیسے مہلک ہتھیار ختم کرنے کی خواہش مان سکتا تھا، یہ تو بہت بے ضرری خواہش تھی۔ میں نے صرف یہ چاہا تھا کہ جن لکیروں نے دنیا کو تقسیم کیا ہے وہ مٹادی جائیں، سرحدیں ختم کردی جائیں، زبان، تہذیب، ثقافت، کھانا، رہن سہن، بول چال، ذات، قبیلے یہ سب فرق ختم کردیے جائیں۔ دنیا کو سمیٹ کر ایک گاؤں بنادیا جائے۔ عالمی گاؤں بنانے کی یہ خواہش جن کو پسند نہیں آئی تھی۔ وہ بہانے بازیاں کرنے لگا۔ مجھے بھی اپنے ماتحتوں کی حکم عدولی پسند نہیں تھی۔ میں نے اس سے سختی کے ساتھ کہا کہ میری آخری خواہش معاہدے میں بیان کی گئی شرائط کے مطابق ہے اس لئے وہ کمپیوٹر میں ڈال کر دیکھے کہ اسے کیا جواب ملتا ہے۔ میرے سخت لہجے سے ڈر کر اس نے کمپیوٹر پر انگلیاں چلانی شروع کیں۔ کوئی بیپ سنائی نہیں دی۔ جنوں کے کمپیوٹر نے میری خواہش تسلیم کر لی تھی۔ جن نے ایک لمبا سانس لے کر لیپ ٹاپ بند کر دیا اور کھڑا ہو گیا۔ اس نے کہا کہ اس خواہش کی تکمیل کے لیے اسے عام جنوں کی نہیں ماہر جنوں کی ضرورت پڑے گی جس میں کچھ وقت لگے گا۔ اس نے کہا اب وہ مجھ سے آخری ملاقات کے لیے اسی وقت آئے گا جب میری ساتویں خواہش پوری ہو جائے گی اور اس کے نتائج سامنے آجائیں گے۔ یہ کہہ کر وہ دھوئیں کے غبار میں بیٹھ کر چلا گیا۔

میں ڈر کے مارے، بہت دنوں تک ٹی وی پر خبریں سننے شراب خانے نہیں گیا۔ گھر سے ہی نہیں نکلا۔ میں نے بہت سوچ سمجھ کر اپنی خواہش بیان کی تھی۔ لیکن پھر بھی ایک انجانا سا خوف تھا۔ میں نے اپنی پچھلی خواہشیں بھی بہت سوچ سمجھ کر تیار کی تھیں۔ لیکن ان کے نتائج بہت بھیانک نکلے تھے۔ اس وقت میں ان نتائج کو بدلنے پر قادر تھا۔ لیکن اگر اس دفعہ کچھ ہوا تو پھر دنیا پیچھے کی طرف نہیں جا سکے گی۔ میں نے دنیا بدل تو دی تھی لیکن اپنی بدلی ہوئی دنیا کو دیکھنے کا حوصلہ نہیں تھا۔

ایک ہفتہ گزر گیا تو ایک شام جن بغیر بلائے آگیا۔ آج اس کے ہاتھ میں کمپیوٹر نہیں تھا۔ وہ جینز اور ٹی وی شرٹ پہنے ہوئے تھا۔ اس نے بڑی گرم جوشی سے مجھ سے ہاتھ ملایا اور کہا کہ وہ اب میرا پابند نہیں رہا، خواہشیں قبول کرنے والا کمپیوٹر بھی اس نے لوٹا دیا ہے اور اب آزاد ہو کر وطن واپس جا رہا ہے اس لیے ڈریس کوڈ سے بھی آزاد ہے۔ میرے چہرے پر فکر اور پریشانی کے آثار دیکھ کر اسے حیرانی ہوئی۔ وہ پوچھنے لگا کہ اپنی آخری خواہش پوری ہونے پر میں خوش کیوں نہیں ہوں۔ میں نے اسے بتایا کہ مجھے اب تک اپنی بدلی ہوئی دنیا دیکھنے کا حوصلہ نہیں ہوا۔ میں گھر سے ہی نہیں نکلا ہوں۔ اس کے

چہرے پر ایک مسکراہٹ آ گئی۔ ''آؤ میں تمہیں تمہاری بدلی ہوئی دنیا دکھاؤں۔'' اس نے بہت خوش دلی سے کہا اور مجھے لے کر گاؤں کے شراب خانے کی طرف چل دیا۔

شراب خانے کا نقشہ بدلا ہوا تھا۔ خوب چہل پہل تھی۔ آسٹریلیا کے قدیمی باشندے مختلف میزوں پر بیٹھے گاؤں کے مقامی لوگوں سے گھل مل کر باتیں کر رہے تھے۔ وہ اپنی قدیم ''کوری'' زبان بول رہے تھے جو آسانی سے سب کی سمجھ میں آ رہی تھی، اس سے پہلے اس شراب خانے میں قدیمی باشندوں کا داخلہ بند تھا۔ وہ گاؤں سے ذرا فاصلے پر اپنی علیحدہ بستی میں رہتے تھے۔ لیکن آج تو پورا جغرافیہ بدل گیا تھا۔ جن مجھے ایک میز پر لے گیا جہاں ایک ویت نامی خاندان بیٹھا وہسکی پی رہا تھا۔ ان کی ویت نامی زبان مجھے انگریزی کی طرح سمجھ میں آ رہی تھی اور میری انگریزی سمجھنے میں انہیں کوئی پریشانی نہیں تھی۔ انہوں نے بتایا کہ وہ بوٹ پر کئی دنوں کا سفر کر کے آسٹریلیا پہنچے تھے اور آج گھومتے ہوئے اس طرف آ نکلے تھے۔ میں نے ٹی وی دیکھا تو اس میں گم ہو گیا۔ کوئی جاپانی فلم آ رہی تھی لیکن مجھے ایسا لگا کہ وہ جاپانی بادشاہ جس کی یہ کہانی تھی میری اپنی تاریخ کا حصہ تھا۔

جن نے دنیا کی خبریں سنا کر مجھے سکتے میں ڈال دیا۔ اس نے بتایا کہ پوری دنیا بدل گئی تھی۔ بھارت کے بازاروں میں چینی بے خوفی سے گھومتے اور خریداری کرتے نظر آتے۔ بھارتی بھکشو، تبت جا کر اپنا روحانی وجدان حاصل کرتے۔ کشمیر کی کنٹرول لائن ختم ہو گئی تھی۔ پہاڑی ندیوں سے دریاؤں میں اترنے والا پانی سرحدوں کے امتیاز کے بغیر دوڑنے لگا تھا۔ ہندو مسلم نفاق ختم ہو گیا تھا۔ میکسیکو سے اب بھی بڑی تعداد میں کیلی فورنیا آنے کا سلسلہ جاری تھا۔ لیکن میکسیکن اب امریکہ میں اجنبی نہیں لگتے تھے۔ اس طرح رچ بس گئے تھے جیسے صدیوں سے یہیں رہتے آئے ہوں۔ امریکیوں کی ایک بڑی تعداد بھی میکسیکو کے بے فکر اور بے پرواہ ماحول میں رہنے کے لئے ان کے علاقوں میں جا کر بسنے لگی تھی۔ کیوبا سے اب بھی کشتیاں غریب الوطنوں کو بھر کر میامی لاتی تھیں لیکن اس سے زیادہ امریکی باشندے میامی سے کیوبا کی طرف پرواز کرنے لگے تھے۔ یورپ میں بھی مشرق و مغرب کی تفریق ختم ہو گئی تھی۔ زبان کا فرق مٹ گیا تو سب کے رنگ ایک دوسرے میں مل گئے۔ اقوام متحدہ کو بیکار سمجھ کر توڑ دیا گیا تھا۔ سرحدی لسانی اور نسلی جھگڑے ختم ہو گئے تو ہتھیاروں کو بھی زنگ لگنے لگا۔ فوجوں کو کھیتی باڑی اور تعمیراتی کاموں پر لگا دیا گیا تھا۔ تھائی اور چینی ہوٹلوں میں فرانسیسی اور ہندوستانی ہوٹلوں میں اٹلی اور

برازیل کے لوگ کھانا کھاتے نظر آئے۔ سری لنکا میں بیس بال اور جاپان میں کرکٹ کھیلی جانے لگی تھی۔ افریقہ میں ستار اور امریکہ میں طبلہ مقبول ہو رہا تھا۔ سرحدیں مٹنے لگیں اور زبان و ثقافت کا فرق دور ہوا تو پوری دنیا سمٹ کر ایک چھوٹا سا گاؤں بن گئی تھی۔

میں جن کے ساتھ کئی گھنٹے گزار کر گھر واپس آیا تو خوشی میں ڈوبا ہوا تھا بہت سی ملی جلی لذتیں مجھ میں سما گئی تھیں۔ میری آخری خواہش نے دنیا کو بدل کر رہنے کے قابل بنا دیا تھا۔ گھر میں آ کر جن میرے سامنے بیٹھ گیا۔ اس کا چراغ مجھے واپس کرنا تھا اس لیے میں نے اسے چمکا کر اور صاف کر کے رکھا تھا۔ اسے دیا تو اس نے مجھے یہ کہہ کر واپس کر دیا کہ جن اور چراغ کی صدیوں پرانی کہانی آج ختم ہو گئی ہے۔ اس چراغ کو رگڑنے سے اب کوئی جن حاضر نہیں ہوگا۔ یہ چراغ یادگار کے طور پر میں اپنے پاس رکھ سکتا ہوں۔ وہ مجھ سے مرعوب تھا کہ حالات کتنے بھی خراب ہوئے میں نے دنیا کو بدلنے کا جذبہ ترک نہیں کیا، ایک بڑی خواہش کا کسی ذاتی خواہش سے سودا نہیں کیا۔ اس نے مجھ سے وعدہ لیا کہ اگر جنوں میں کبھی قبائلی اور نسلی جنگ چھڑی تو امن قائم کرنے میں مدد دینے میں ان کے دیس ضرور آؤں گا۔ میں نے اسے اپنی واڈکا کی خالی بوتل دی اور کہا کہ وہ جب بھی یہ بوتل رگڑے گا میں حاضر ہو جاؤں گا۔ وہ ہنستا ہوا بہت گرمجوشی سے ہاتھ ملا کر اور دھوئیں کے غبار پر سوار ہو کر رخصت ہو گیا۔ واڈکا کی خالی بوتل وہ سچ مچ ساتھ لے گیا تھا اور شاید اپنے وطن پہنچتے ہی اسے میری ضرورت پیش آ گئی تھی۔ مجھے ایسا لگا جیسے دھوئیں کے ایک بادل پر سوار میں بھی آسمانوں میں اڑا جا رہا ہوں۔

(ناول ''بے وطن'' سے اقتباس)

امید

(1)

''وزیراعظم ریاض توصیف!''

''زندہ باد!''

اس نے اپنے پھیپھڑوں کی پوری قوت استعمال کر کے نعرے کا جواب دیا۔ سینے میں درد کی ایک لہر اٹھی لیکن اسے پروانہیں تھی۔ آج اس کی اُمید برآنے کا دن تھا۔ بس اسے کسی طرح آگے پہنچنا تھا۔ لیکن آگے بڑھنے کی کوشش میں وہ چند قدم اور پیچھے دھکیل دیا گیا۔ اس نے اپنے دائیں ہاتھ میں پارٹی کے کارکنوں کو جاری کیا جانے والا کارڈ تھاما ہوا تھا اور پنجوں کے بل اچک اچک کر دائیں ہاتھ میں دبا ہوا کارڈ بلند کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اسے یقین تھا پارٹی کے کسی ذمے دار نے دیکھ لیا تو اسے کھینچ کر آگے لے جائے گا۔ آگے راجہ صاحب ہوں گے۔ وہ اسے وزیراعظم کے پاس لے جائیں گے۔ انتخابات کے زمانے میں یہ کارڈ جادو کی طرح کام کرتا تھا۔ ہر جلوس میں سب سے آگے، نعرہ لگانے والوں میں سب سے پہلے۔ ایک دفعہ تو وہ اس ٹرک پر بھی چڑھ چکا تھا جس پر سوار ہو کر ریاض توصیف نے انتخابی جلوس کی قیادت کی تھی۔ اور انتخابات کے دن جب ریاض توصیف ووٹ ڈالنے آیا تھا تو اس کے گرد ہاتھوں کی زنجیر بنا کر اور گھیرا ڈال کر اسے لے جانے والوں میں وہ بھی شامل تھا۔ اس کے ہاتھ

ریاض توصیف کا جسم چھو رہے تھے۔ اس کے پورے بدن میں روشنی بھر گئی تھی۔ اسے یقین ہو گیا تھا کہ انتخابات جیت کر ریاض توصیف وزیر اعظم بنا تو ملک کی ہی نہیں خود اس کی تقدیر بھی بدل جائے گی۔ اسی وقت کسی کی کہنی اس کے سینے میں لگی اور وہ دوہرا ہو کر چیخ پڑا۔

''اوئے سوّر دے پترا......''

سوّر دے پترا نے جو پہلوان نما آدمی تھا اپنی لال لال آنکھوں سے اسے دیکھا تو وہ اس کی آنکھوں کے سامنے اپنا کارکنوں والا کارڈ لہرانے لگا۔

''چنگی تراں انکھاں کھول کے وکیھ لے۔ میں پارٹی دا خاص بندہ آں۔ خاص بندہ۔''

''تیرے خاص بندے دی بہن نوں......''

اسی وقت کسی نے وزیر اعظم ریاض توصیف کا نعرہ لگایا اور وہ ''زندہ باد'' کہنے کے جوش میں پوری گالی نہیں سن سکا۔ نعروں کے ساتھ ہی وہ چند قدم اور پیچھے ہو گیا۔ اسے قدم مضبوطی سے جما کر رکھنے تھے۔ نیچے اترنے والی سیڑھیاں چند ہی قدم پیچھے تھیں۔ ایک دفعہ باہر ہو گیا تو کبھی آگے نہیں پہنچ پائے گا۔ اس میں اب پہلے والا دم خم نہیں تھا۔ اس کی دس سال پہلے والی صحت ہوتی تو دیکھتا کہ وہ سور دا پتر کس طرح اسے پیچھے دھکیل کر آگے بڑھ جاتا۔ دل کی بیماری نے ساری طاقت سلب کر لی تھی۔ اس کے بیٹے نے اسے آنے سے منع کیا تھا۔ لیکن وہ نہیں مانا تھا۔ ایسا موقع بار بار ملنا مشکل تھا۔

ریاض توصیف وزیر اعظم بننے کے بعد پہلی بار لاہور آ رہا تھا۔ اس نے اخبار میں پڑھا تو مال ختم ہونے کا انتظار نہیں کیا تھا۔ وقت سے پہلے ٹھیلا گھر لے آیا اور راجہ صاحب کے پاس چلا گیا تھا۔ راجہ صاحب کو انتخابات میں جتانے کے لیے اس نے بہت کام کیا تھا۔ راجہ صاحب اسے مانتے بھی بہت تھے۔ وہ چٹھی لکھ کر نہیں دیتے تو ہسپتال میں اس کے دل کا معائنہ بھی نہ ہوتا۔ نہ اسے پتا چلتا کہ اس کے دل کی کتنی رگیں بند ہیں۔ انہوں نے وعدہ کیا تھا کہ ریاض توصیف کی حکومت آتے ہی اس کے بیٹے کی نوکری کی درخواست پر خود وزیر اعظم سے حکم لکھوائیں گے۔ اس کا بیٹا دسویں پاس کر کے دو سال سے ڈنڈے بجا رہا تھا۔ اس کے بیٹے نے اس سے بہت کہا تھا کہ وہ آرام کرے۔ اس کی جگہ ٹھیلا وہ لگایا کرے گا۔ لیکن یہ سن کر اسے غصہ آ گیا تھا۔ اس کا میٹرک پاس بیٹا چھولے نہیں بیچے گا۔ وہ خاندان کا پہلا پڑھا لڑکا تھا۔ وہ بابو بنے گا، بابو۔ اسے بابو بنانے کے لیے وہ عامر نذیر کو بھی آزما کر دیکھ چکا تھا۔

اس نے سنا تھا جاگیردار اپنے خاندان کے لوگوں کو مختلف پارٹیوں میں بانٹ دیتے ہیں۔ کوئی بھی پارٹی اقتدار میں آئے، ان کے مفادات کو نقصان نہیں پہنچتا۔ وہ خود پارٹی سے غداری نہیں کر سکتا تھا، اس لیے اس نے اپنے بیٹے کو عامر نذیر کی پارٹی میں بھیج دیا تھا جس کی اس وقت حکومت تھی۔ اس کا بیٹا گلی گلی جیے عامر نذیر کے نعرے لگاتا رہا لیکن نوکری کی کوئی امید نظر نہیں آئی تو گھر آ کر بیٹھ گیا۔ گھر بیٹھے بیٹے کو دیکھ کر اسے ریاض توصیف کی تقریروں کے ایک ایک لفظ پر مکمل یقین ہو گیا تھا۔ عامر نذیر کی حکومت نے مہنگائی اور بیروزگاری بڑھائی تھی۔ پارٹی کے جلسوں میں عامر نذیر کے خلاف نعرے لگاتے ہوئے اس کا جوش اور بڑھ جاتا۔

اسے خوف تھا کہ اس کا بیٹا ہری پگڑی والوں میں شامل نہ ہو جائے۔ اس کے پڑوسی کے بیٹے نے، جس نے اس کے بیٹے کے ساتھ دسویں پاس کی تھی، چھ مہینے پہلے داڑھی بڑھا کر سبز پگڑی پہن لی تھی اور اب نیفے میں پستول اڑس کر اسکوٹر پر گھومتا تھا۔ پورا محلہ اس سے ڈرتا تھا۔ اسے پتا تھا کہ وہ کسی کو مار کر جیل جائے گا یا خود مارا جائے گا۔ اسے اپنے بیٹے کا یہ انجام پسند نہیں تھا۔ اسی لیے وہ کل سرِ شام ہی راجہ صاحب کی حویلی میں جا کر بیٹھ گیا تھا۔ راجہ صاحب انتخابات کے بعد بہت مصروف ہو گئے تھے۔ اس نے پہلے بھی کئی بار کوشش کی تھی۔ لیکن وہ زیادہ تر اسلام آباد میں ہوتے تھے۔ لاہور آتے تو کسی نہ کسی اجلاس میں مصروف رہتے۔ اس نے سوچا تھا آج وہ ملے بغیر نہیں جائے گا۔ لیکن راجہ صاحب کا اجلاس جاری تھا۔ اجلاس ختم ہوا تو انہیں کہیں کھانے پر جانا تھا۔ راجہ صاحب کے سیکرٹری نے اسے بتایا وزیراعظم ریاض توصیف کل چادر چڑھانے داتا دربار جائے گا۔ تمام کارکن وہیں جمع ہوں گے۔ وہ بھی آ جائے۔ راجہ صاحب اس کی درخواست پر وزیراعظم سے وہیں دستخط کروا دیں گے۔ وہ خوش خوش گھر آ کر سو گیا تھا۔ خواب میں اس نے اپنے بیٹے کو بابو اور پھر ترقی کر کے وزیراعظم بنتے دیکھا۔

صبح اٹھ کر اس نے ٹھیلے کی طرف نگاہ بھی نہیں کی۔ چٹے رنگ کا وہ شلوار کرتا پہنا جو وہ صرف خاص موقعوں پر پہنتا تھا۔ بیٹے کی نوکری کی وہ درخواست نکالی جو اس نے کچہری کے باہر بیٹھے ہوئے بابو سے ٹائپ کرائی تھی اور جو اس نے ایک سال سے تہہ کر کے اپنے ٹین کے صندوق میں رکھی ہوئی تھی۔ اس کا بیٹا چھت پر چڑھا ہوا سوراخ بند کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ چند دن پہلے بارش ہوئی تھی تو ان کی چھت جگہ جگہ سے ٹپکنے لگی تھی۔ باپ نے جب اسے بتایا کہ وہ کہاں جا رہا ہے تو وہ نیچے اتر آیا۔

''ہجوم میں پھنس کر تیری سانس گھٹ جائے گی۔ نہ جا۔''

''میرے پاس یہ ہے!'' اس نے بڑے فخر سے پارٹی کا کارڈ دکھایا۔ اس کی بیوی کونے میں بیٹھی چھولے کی دیگ مانجھ رہی تھی اور بار بار پلّو سے آنکھیں پونچھ رہی تھی۔

''حرام دی جڑیں موکا بے موکا رویا نہ کر۔ تیرے پیو دا جنازہ نئیں اٹھ ریا۔'' بیوی کو زیرِ لب گالیاں بکتا ہوا وہ باہر نکل آیا۔ پاؤں بہتے ہوئے گندے پانی پر پڑنے سے بال بال بچے تھے۔ وہ باآواز بلند ایک اور گالی دینے ہی والا تھا کہ اسے خیال آیا اس گندے پانی کی بڑی وجہ وہ خود ہے۔ چند مہینے پہلے پڑوسیوں سے اس کا جھگڑا ہو چکا تھا۔ وہ شکایت کر رہے تھے کہ اس کی دیگ دھلنے کی وجہ سے پوری گلی میں کیچڑ بھر گئی ہے۔

''اوئے فکر نہ کر۔ ساڈا شیر آوے ہی آوے۔ اپڑیں حکومت آندیاں ایں گلی پکی کرا دیاں گا۔'' اس نے سینہ تان کر سیاست دانوں والا وعدہ کیا تھا اور سب مرعوب ہو کر اپنے اپنے گھروں کو چلے گئے تھے۔ سب کو پتا تھا وہ ریاض توصیف کی پارٹی کا آدمی ہے۔ اس کی چھت بوسیدہ سہی مگر اس پر لہرانے والا پارٹی کا جھنڈا سب سے اونچا تھا۔ گندے پانی کی بہتی ہوئی دھار سے بچنے کے لیے لمبے لمبے قدم رکھتا وہ گلی سے نکلا تو اسے گلی پکی کرانے کا وعدہ یاد آ گیا۔ اس نے کندھے جھٹک دیے۔ صرف اس کی گلی کچی نہیں تھی۔ ہر گلی میں کیچڑ اور گندگی کے ڈھیر لگے تھے۔ صرف ایک گلی پکی کیسے ہو سکتی تھی۔ پھر بھی کوشش کرے گا۔ راجہ صاحب وزیر ہو گئے تو محلے والوں کی طرف سے ان کے لیے جلسہ کرائے گا۔ وہ اگر آنے پر راضی ہو گئے تو گلی خود بخود پکی ہو جائے گی۔ اس وقت تو وہ زیادہ بڑے مشن پر جا رہا تھا۔ اسے اپنے بیٹے کے مستقبل کو جانے والی سڑک پکی کرانی تھی۔

اچانک نعروں میں بہت جوش آ گیا۔ ہجوم کی دھکم پیل بھی بڑھ گئی۔ ہر طرف سے لہریں زور مارنے لگیں۔ آگے کی طرف سے لگاتار نعرے لگ رہے تھے۔

''ساڈا چیف تاڈا چیف۔''

''ریاض توصیف۔ ریاض توصیف۔''

نعروں کی سفر کرتی ہوئی آواز سے اسے اندازہ ہو گیا کہ محافظوں کے گھیرے میں پارٹی کے لیڈروں کے ساتھ ریاض توصیف چادر چڑھانے کے لیے آگے بڑھ رہا ہو گا۔ ریاض توصیف کے

ساتھ لوگوں کا نیا ریلا داخل ہو گیا تھا اس لیے لہریں پیچھے کی طرف آ رہی تھیں۔ اس نے اپنی ساری قوت لگا دی پھر بھی چند قدم اور پیچھے کھسکتا چلا گیا۔ اس جدّوجہد کے باوجود وہ نعروں کا پوری شدت سے جواب دے رہا تھا۔ وہ ہاتھ بھی جس میں پارٹی کا کارڈ تھا اسی طرح بلند تھا۔ اس نے ایک دفعہ اور اچکنے اور اچھلنے کی کوشش کی، شاید اسے رلجہ صاحب نظر آ جائیں یا ان کی نظر اس پر پڑ جائے اور وہ اسے آگے بلا لیں۔ لیکن وہ اوپر کی طرف جنبش بھی نہیں کر سکا۔ چاروں طرف سے جسموں نے اس طرح جکڑا ہوا تھا کہ حرکت ممکن ہی نہیں تھی۔ سینے میں کھنچاؤ محسوس ہوا تو اس نے اپنا بلند کیا ہوا ہاتھ واپس کھینچنے کی کوشش کی۔ دل پر اپنا ہاتھ رکھتا تو قرار آ جاتا لیکن اس کا بازو بھی چاروں طرف سے کندھوں میں جکڑا ہوا تھا۔ ہاتھ اسی طرح اٹھا رہا۔ واپس نہ آ سکا۔

غلطی خود اس کی تھی۔ اسے ہمیشہ کی طرح کارکنوں کی ٹولی کے ساتھ آنا چاہیے تھا۔ کارکنوں کا جلوس وزیراعظم کے پیچھے نعرے لگاتا ہوا داخل ہوا ہو گا۔ انہیں کون روک سکتا تھا۔ وہ بھی ان کے ساتھ ہوتا۔ لیکن اس نے سیانا بننے کی کوشش کی تھی۔ اسے پتا تھا ہر کارکن کی جیب میں ایک درخواست ہو گی۔ نوکری کی، دل گردے کا علاج کرانے کی، کسی اپنے کو کالج میں داخل دلانے یا دبئی کا ویزا لگوانے کی۔ پتا نہیں اس کی باری آتی بھی یا نہیں۔ اسی لیے وہ وقت سے چار گھنٹے پہلے اکیلا آ کر بیٹھ گیا تھا۔ وزیراعظم کا جلوس جیسے ہی اندر آتا وہ لپک کر رلجہ صاحب کی پناہ میں چلا جاتا جو اس کی درخواست ریاض توصیف کے سامنے کر دیتے۔ وزیراعظم کا قلم سب سے پہلے اسی کی درخواست پر چلتا۔ پیچھے آنے والے تمام کارکن اسے حیرت سے دیکھتے رہ جاتے۔

داتا دربار کے ٹھنڈے فرش پر جا کر بیٹھا تھا تو اسے لگا تھا جیسے حضرت گنج بخش نے اپنا سایہ اس پر دراز کر دیا ہو۔ آنکھ کھلی تو ایک پولیس والا بید سے مار کر اسے اٹھا رہا تھا۔ وہ ہڑبڑا کر کھڑا ہو گیا تھا۔ چاروں طرف وردی والے اور سادہ پوش سپاہیوں اور پولیس افسروں کا مجمع تھا۔ اس نے گھڑی دیکھی، وزیراعظم کے آنے میں ایک گھنٹہ باقی تھا۔ پولیس والے ایک ایک کونے میں بم یا آتش گیر مادہ تلاش کر رہے تھے اور ہر مشکوک نظر آنے والے شخص کو وہاں سے نکال رہے تھے۔ وہ پولیس کی اس کارکردگی پر خوش ہونے لگا تھا۔ یہ اس کے لیڈر کی زندگی کا سوال تھا۔

''او بابے چل اتھوں نس جا۔'' ایک پولیس والے نے اس کی طرف اشارہ کیا۔ اس نے پلٹ کر

دیکھا، پیچھے کوئی نہیں تھا، وہ اسی سے مخاطب تھا۔ اس نے مسکراتے ہوئے پارٹی کارڈ پولیس والے کی آنکھوں کے سامنے کر دیا۔

''اس نوں تو اتھے واڑ لے۔'' پولیس والے نے فحش اشارہ کرتے ہوئے بازو پکڑ کر اسے دھکا دیا۔ اس کا ماتھا گھومنے لگا تھا، لیکن پھر بھی اس نے اپنا دماغ ٹھنڈا رکھا اور پولیس والے کو بتانے لگا تھا کہ وہ پارٹی کارکن اور راجہ سائیں کا آدمی ہے۔

''جا کے وڑ جا راجہ صاحب دی......'' پولیس والے نے منہ ہی منہ میں بڑبڑاتے ہوئے اس کی گدی پکڑ کر زور کا دھکا دیا تھا۔ وہ پولیس والوں کے دھکّے کا عادی تھا اس لیے برا مانے بغیر کپڑے جھاڑتا ہوا اٹھ کھڑا ہوا اور وہاں سے باہر نکل آیا۔ وہ عامر نذیر کی حکومت کے خلاف مظاہروں میں ہمیشہ آگے آگے ہوتا تھا۔ پولیس کے دھکے اور لاٹھیاں کھانا روز کی بات تھی۔ ڈنڈے کھا کر بھاگتے بھاگتے وہ پلٹ کر ایک پتھر ضرور مار جاتا۔ لیکن اب تو اس کی اپنی حکومت تھی۔ خود اپنے سر پر پتھر کیسے مارتا۔ مگر وہ ان کو چھوڑے گا نہیں۔ اس نے پولیس والے کی شکل اچھی طرح پہچان لی تھی۔ اس نے راجہ صاحب کی بے عزتی کی تھی۔ وہ اس کی پیٹی اتروا دے گا۔ بس آج کا دن نکل جائے۔ پہلے اس کا کام ہو جائے۔

وہ دوسری طرف سے اندر آ گیا تھا جہاں اب مجمع بڑھتا جا رہا تھا۔ یہاں سے نکل کر وہ اس طرف جا سکتا تھا جہاں وزیر اعظم کو آنا تھا۔ اسے کسی طرح راجہ صاحب کی توجہ حاصل کرنی تھی۔ وہ اسے دیکھتے ہی اپنے پاس بلوا لیں گے۔ انہوں نے وعدہ کیا تھا۔ لیکن ہجوم بڑھتا جا رہا تھا۔ جو زور آور تھے وہ کہنیاں مارتے مارتے آگے بڑھ رہے تھے۔ وہ بھی اپنی جگہ قائم نہ رہ سکا تھا۔ دھکّے کھاتا ہوا بہت پیچھے آ گیا تھا۔ لیکن اس کی امید پھر بھی قائم تھی۔ وزیر اعظم چادر چڑھانے کے بعد واپس پلٹیں گے تو زور ٹوٹے گا اور وہ رستا بنا کر ان کے سامنے پہنچ جائے گا۔ راجہ صاحب نے نہیں دیکھا تو وزیر اعظم کی گاڑی کے سامنے لیٹ جائے گا۔ وہ اپنا دیا ہوا کارڈ ضرور پہچانیں گے۔ وہ کارکنوں کی بہت عزت کرتے ہیں۔

سینے میں درد کی ایک اور لہر آئی لیکن وہ برداشت کر گیا۔ ہجوم نے اس کا پورا جسم شکنجے میں جکڑ لیا تھا۔ نہ نیچے لٹکا ہوا بایاں ہاتھ اوپر لے جا سکتا تھا اور نہ اوپر اٹھا ہوا اپنا وہ دایاں ہاتھ نیچے لا سکتا تھا جس میں پارٹی کا کارڈ دبا ہوا تھا۔ اس کی ایڑیاں پہلی سیڑھی کو چھو رہی تھیں۔ سامنے سے پیچھے کی طرف جو زور لگ رہا تھا وہ اس کا پوری طاقت سے مقابلہ کر رہا تھا۔ اچانک پیچھے والوں نے ''یا علی مدد'' کہہ کر زور کا

دھکا لگایا تو وہ کئی قدم آگے چلا گیا۔ لیکن آگے والوں کا دباؤ بھی واپس زور مار رہا تھا۔ جو کمزور تھے ان کے بدن کی ہڈیاں کڑکڑانے لگیں۔ اس نے اپنی سانس روک لی اور سینے کو پھلا کر اپنی دانست میں لوہے کا کر لیا۔ آگے سے کسی نے پھر نعرہ لگایا۔ ''وزیراعظم ریاض توصیف۔'' تو اس نے سانس چھوڑ دی اور پھیپھڑوں کا پورا زور لگا کر جواب دیا۔

''زندہ با......'' آواز حلق ہی میں دم توڑ گئی۔ سانس واپس نہیں آ رہی تھی۔ وہ ''پانی۔ پانی'' چلا رہا تھا لیکن صرف خرخر کی آواز نکل رہی تھی۔ آگے اور پیچھے کے دھکوں میں تھوڑی دیر جھولتے ہوئے خرخر کی آوازیں بھی بند ہو گئیں۔ اس کا دایاں ہاتھ اسی طرح اکڑا ہوا ہوا میں بلند رہا لیکن گردن کئی جھٹکے کھا کر ایک طرف لڑھک گئی۔ پلکوں نے بھی جھپکنا بند کر دیا تھا۔ وزیراعظم ریاض توصیف زندہ باد کا شور دور ہوتا جا رہا تھا۔ وزیراعظم شاید چادر چڑھا کر واپس چلے گئے تھے۔ تماشا ختم ہو گیا تھا۔ جو پیچھے تھے وہ پیچھے سے واپس چلے گئے۔ جو آگے تھے وہ دائیں بائیں ہونے لگے۔ شکنجہ اچانک کھل گیا تو اس کا جسم ٹوٹے ہوئے ستون کی طرح فرش پر گر پڑا۔ واپس جاتے ہوئے لوگ تیزی سے اس کی طرف پلٹے اور فرش پر پڑے ہوئے اس کے جسم کو اپنے نرغے میں لے لیا۔ کوئی ہتھیلی سہلا رہا تھا اور کوئی پاؤں کے تلوے۔

''پانی لاؤ پانی!'' کوئی زور سے چیخا۔ ان میں سے ایک جو زیادہ تجربہ کار تھا وہ سینے سے کان لگا کر اس کے دل کی دھڑکن سننے کی کوشش کرنے لگا۔ کچھ سنائی نہیں دیا تو ناک پر ہاتھ رکھ کر سانس کی گرمی محسوس کرنے کی کوشش کی اور نفی میں سر ہلاتا ہوا اُٹھ کھڑا ہوا۔ ایک نوجوان اس کے اکڑے ہوئے ہاتھ کو واپس اپنی جگہ لانے لگا تو ہاتھ میں دبا ہوا کارڈ گر پڑا۔ نوجوان دیکھتے ہی چیخ پڑا۔

''یہ ہمارا کارکن ہے۔ ہماری پارٹی کا کارکن۔ ہٹ جاؤ ہٹ جاؤ۔'' بھیڑ چھٹنے لگی۔ لوگوں نے اطمینان کی سانس لی۔ لاش لاوارث نہیں رہی تھی۔ اس کا وارث مل گیا تھا۔ پارٹی کے ایک دوسرے کارکن نے جس نے پارٹی کا ایک بڑا سا جھنڈا اٹھایا ہوا تھا پرچم کو ڈنڈے سے الگ کر کے لاش پر ڈال دیا، پارٹی کارڈ تمغے کی طرح اس کے سینے پر رکھ دیا اور اس کی آنکھوں کو جن میں امید بیٹھی ابھی تک جھانک رہی تھی بند کرنے لگا۔ آنکھیں بند ہونے سے پہلے امید پھدک کر آنکھوں سے باہر نکل آئی اور کوئی نیا گھر تلاش کرنے چل پڑی۔

(2)

''جیے عامر!''

''سدا جیے۔''

جیے عامر۔سدا جیے۔ جیے عامر سدا جیے۔ جیے عامر سدا جیے......

نعرہ رقص کی دھن بن گیا۔ وہ خالی اسٹیج پر دونوں ہاتھ اٹھائے نعرہ لگاتے ہوئے تھرک رہا تھا۔ وہ لیوا رقص کا ماہر تھا۔ اس کے بدن کی بوٹی بوٹی تھرک رہی تھی۔ اس کا من بھی اندر سے ناچ رہا تھا۔ باوردی نے پہلی بار اس کی ڈیوٹی اسٹیج پر لگا کر اسے اسٹیج کا انچارج بنایا تھا۔ صرف وہی لوگ اسٹیج کے آس پاس آ سکتے تھے جن کے پاس باوردی کے دیے ہوئے پاس تھے۔ اسٹیج کے اوپر تو پاس والوں کا آنا بھی منع تھا۔ باوردی ایک گھنٹہ پہلے کچھ لوگوں کو لے کر آیا تھا جنھوں نے اسٹیج کے اوپر نیچے چاروں طرف اچھی طرح جائزہ لیا تھا۔ بھن بھن کرتا ہوا ایک برقی آلہ ہر طرف نچایا تھا اور پھر مطمئن ہو کر چلے گئے تھے۔

''اب اسٹیج پر کوئی بھی نہیں آئے گا۔ کوئی بھی نہیں۔'' باوردی جاتے جاتے اسے ہدایت کر کے گیا تھا۔ باوردی کو کلفٹن سے عامر نذیر اور آصفہ کو لے کر آنا تھا۔ ان کی کاروں کا جلوس منظم کرنا تھا۔ آگے پیچھے کم از کم پچاس پجیرو جیپیں ہوں گی۔ کلفٹن سے لیاری تک...... پوری کراچی کلاشنکوف رائفلوں کی ہوائی فائرنگ سے گونج اٹھے گی۔ باوردی عامر نذیر کو دکھانا چاہتا تھا کہ کراچی آج بھی اس کے ساتھ ہے۔ جب تک اس کے پاس پجیرو اور ہاتھ میں کلاشنکوف ہے کراچی اس سے کوئی نہیں چھین سکے گا۔

''اڑے او چابی۔ او ترازو۔ اڑے او برش......'' اس نے نعرے روک کر ایک داڑھی والے شخص کو للکارا جو اسٹیج کی طرف بڑھ رہا تھا۔ اس کی آواز سنتے ہی اسٹیج کے آس پاس پہرہ دینے والے کارکنوں میں سے دو تین لڑکے داڑھی والے شخص کی طرف لپکے۔ داڑھی والا تھوڑی دیر بحث کرتا رہا لیکن پھر دو چار دھکے کھانے کے بعد واپس چلا گیا۔ جاتے جاتے اس نے پارٹی کا کارڈ نچا کر اسے دور سے دکھایا تھا۔

''اڑے شکل گم کرو نی۔'' اس نے بے نیازی سے کہا۔ اسے اس وقت اپنے اہم ہونے کا احساس ہوا۔ کارکن کس طرح اس کی ایک ہی للکار پر دوڑ پڑے تھے۔ اس نے اپنے سینے پر لگے ہوئے

لال اور ہرے ربن سے بنے پھول جیسے بیج کو ٹھیک کیا جس کے بیچ عامر نذیر کی تصویر لگی تھی۔ آج وہ اس تصویر پر عامر نذیر سے دستخط بھی لے گا۔ اس کا یہ بیج امر ہو جائے گا۔ ایسا خزانہ تو اس کے باپ کے پاس بھی نہیں تھا جو عامر نذیر کے باپ کے زمانے سے ''جیے نذیر'' کے نعرے لگا رہا تھا۔ اسے یقین ہو گیا تھا کہ وہ آج کی کارگزاری کے بعد باوردی کا مستقل نائب ہو جائے گا۔ ایسا ہو گیا تو پھر اس کی ڈیوٹی بھی عامر نذیر کے بند کمرے کے دروازے کے باہر لگ سکتی تھی۔ باوردی کی طرح اس کی قسمت کا دروازہ بھی کھل سکتا تھا۔

باوردی کی قسمت پر سب رشک کرتے تھے۔ اس کا نام کچھ اور تھا لیکن باوردی کہلاتا تھا۔ پہلے سب اسے مذاق میں عامر نذیر کا دربان کہتے تھے۔ اس کی ڈیوٹی دروازے پر ہوتی اور وہ عامر نذیر کے ملاقاتیوں کو اندر لانے لے جانے کا کام کیا کرتا تھا۔ وہ اس کام کو بہت سنجیدگی سے لیتا تھا۔ خاکی رنگ کی وردی پہن کر آتا اور سائے کی طرح اپنا سینہ پھلائے عامر نذیر کے آگے پیچھے رہتا۔ عامر نذیر سے ملنے والوں کے لیے ضروری تھا کہ وہ اسے خوش رکھیں۔ عامر نذیر کو بھی اس کی عادت سی ہو گئی تھی۔ وہ وزیراعظم بن کر اسلام آباد چلا گیا تو کراچی کے معاملات باوردی کے حوالے کر گیا۔ اس کی تیزی سے ہوتی ہوئی ترقی کو دیکھ کر جلنے والے اسے عامر نذیر کا نورا کہتے تھے۔ لیکن باوردی خود کو خدا کا تحفہ کہتا تھا جسے عامر نذیر کے لیے آسمان سے اتارا گیا تھا۔ اسے کسی کے مذاق کی پروا نہیں تھی۔ جب تک عامر نذیر اس سے خوش تھا پوری دنیا اس کی تھی۔ ایک دن عامر نذیر کراچی میں تھا اور اس کا موڈ بہت اچھا تھا۔ اس نے باوردی کو سندھ کے وزیراعلیٰ کا مشیر بنوا دیا۔ مشیر بننے کے بعد اس نے وردی پہننی بند کر دی۔ لیکن باوردی کا نام اس کے بدن پر ٹنگا رہ گیا۔ وہ اس نام کا بھی برا نہیں مانتا تھا۔ یہ نام اسے عامر نذیر نے دیا تھا۔ یہ نام اس کے لیے تمغے کی طرح تھا۔

اسٹیج سے اب وہ نغمے بجنے لگے تھے جو خاص طور پر عامر نذیر اور اس کی پارٹی کے لیے تیار کیے گئے تھے، اس لیے اس نے نعرے لگانے بند کر دیے۔ باوردی نے اسے ہوشیار رہنے کی ہدایت کی تھی۔ وہ بہت چوکنا ہو کر اسٹیج کے چاروں طرف چکر لگانے لگا۔ جسم میں جوش کی لہریں اٹھ رہی تھیں۔ عامر نذیر کے آنے تک یہ اسٹیج اس کا تھا۔ اس نے فخر کے ساتھ سامنے پھیلے ہوئے میدان کی طرف دیکھا جہاں کارکنوں کے قافلے آ کر جمع ہو رہے تھے۔ اسے لگا جیسے اسٹیج ہی نہیں پوری دنیا اس کی ہو گئی ہو۔ ہر شخص

اسے دیکھ رہا ہو۔ اسٹیج سے بجنے والا ٹیپ ختم ہوا تو اس نے جیے عامر، سدا جیے کے نعرے لگا کر پھر رقص شروع کر دیا۔ اسٹیج کے چاروں طرف پھیلے ہوئے کارکن بھی دونوں ہاتھ سر کے اوپر بلند کر کے تالیاں بجانے اور تھرکنے لگے۔

نعروں کی لے پر اس کا جسم خودکار طریقے سے تھرکنے لگتا تھا۔ آج سے نہیں، وہ اس دھن پر بچپن سے تھرک رہا تھا۔ یہ دھن اس کی رگ و پے میں سما گئی تھی۔ بیس سال پہلے اسی میدان میں عامر نذیر کے باپ کا جلسہ ہوا تھا تو اس کی عمر تین سال کی تھی۔ وہ اپنے باپ کے کندھوں پر چڑھ کر آیا تھا اور اس نے باپ کی آواز میں آواز ملا کر ''جیے نذیر سدا جیے'' کے نعرے لگائے تھے۔ اس کے باپ نے پوری عمر عامر نذیر کے باپ اور پھر اس کے بیٹے کے لیے نعرے لگانے میں گزار دی تھی۔ کچھ ملا تھا تو پولیس کی لاٹھیاں، حوالات کی سیر۔ پہلے اس کے باپ کے پاس دو گدھے ہوتے تھے، اب ایک رہ گیا تھا۔ اس نے اپنے باپ کو صاف صاف بتا دیا تھا کہ وہ زندگی بھر گدھا گاڑی نہیں چلائے گا۔ جیسے ہی اس کا بچپن باپ کی گرفت سے آزاد ہوا اس نے ٹین کا وہ ڈبہ جس میں کنکر بھرے ہوئے تھے اور جسے بجا بجا کر وہ ٹریفک کو اپنے اور گدھے کے وجود سے آگاہ کرتا، اپنے چھوٹے بھائی کے حوالے کیا اور گدھا گاڑی کے کام میں باپ کا ہاتھ بٹانا بند کر دیا۔ وہ سینماؤں پر نئی فلموں کے ٹکٹ بلیک میں بیچتا یا پرانے شہر کی پچھلی گلیوں میں اسمگلروں کا سامان بدن میں چھپائے پھرتا۔ رات کو پارک میں وہ اور اس کے دوست مل کر جھاڑیاں جلاتے اور چرس پی کر آگ کے الاؤ اور دھویں کے گرد لیوا کی دھن پر اپنے بدن کی بوٹیاں تھرکاتے اور پھر بھونکتے ہوئے آوارہ کتوں کی آواز میں آواز ملاتے یا انہیں پتھر مارتے ہوئے اپنے اپنے گھر چلے جاتے۔

زندگی کلفٹن کی سیر بن کر گزر رہی تھی۔ صرف پجیرو اور ایک کلاشنکوف کی کمی تھی۔ اسے یقین تھا اب یہ کمی بھی پوری ہونے والی تھی۔ آج کے بعد وہ باوردی کا نائب بن کر اس کی پجیرو میں بیٹھے گا۔ ہو سکتا ہے باوردی اسے کلاشنکوف بھی دلوا دے۔ کلاشنکوف نہیں ٹی ٹی۔ اسے ٹی ٹی زیادہ پسند تھی۔ چھوٹی اور ٹھاں ٹھاں کرنے والی۔ اسے پتہ تھا وہ باوردی کی طرح کبھی مشیر نہیں بن سکے گا۔ اسے مشیر بننا بھی نہیں تھا۔ باوردی کی طرح اس کی زبان ریشم کی نہیں تھی۔ وہ باوردی کی طرح بارہ جماعت پاس بھی نہیں تھا۔ صرف تیسری جماعت میں تھا جب اس کے باپ نے اسے گدھے میں جوت دیا تھا۔ اسے باوردی

کی طرح کلفٹن میں بنگلہ، ریکروٹنگ کا لائسنس یا اسٹیل مل کا ٹھیکہ بھی نہیں چاہیے تھا۔ اسے تو کراچی دبئی کراچی چلنے والی ایک لانچ کی حصے داری لینا تھی۔ اسے راجہ بننا تھا۔ سمندروں کا راجہ۔ لیکن اس کے لیے عامر نذیر کا دوبارہ حکومت میں آنا ضروری تھا۔ اس نے پوری قوت سے نعرہ لگایا۔

''جیے عامر نذیر۔''

''سدا جیے۔'' مجمع پورے جوش سے جواب دے رہا تھا۔ اس کے ساتھ ہی اسے پارک کے باہر گرد و غبار اڑتا نظر آیا۔ پوری فضا فائرنگ سے گونج گئی۔ عامر نذیر کی کاروں کا جلوس شاید جلسہ گاہ تک پہنچ گیا تھا۔ ہجوم میں کلاشنکوف کی کئی نالیاں بلند ہوئیں اور لوگوں سے بھرے میدان میں تڑ تڑ تڑ کی آوازوں کا شور اٹھنے لگا۔ پنڈال میں کئی گھنٹوں سے بیٹھے ہوئے لوگوں میں ہلچل مچ گئی۔ وہ اٹھ کر پیچھے کی طرف دیکھنے لگے۔ ڈھول کی تھاپ تیز ہوئی اور اس کی تال پر'' آئے گا بھئی آئے گا۔ شیر ہمارا آئے گا۔'' اور'' جیے عامر سدا جیے'' کے نعروں پر وحشیانہ اچھل کود شروع ہوگئی۔ اسٹیج تک کے راستے پر جو سرخ دری بچھی تھی اس کے دونوں طرف ایک دوسرے کو دھکا دے کر اپنے لیے جگہ بناتی ہوئی عورتوں کی صف تھی۔ وہ اب ہاتھوں میں ہار اور پھولوں کی پتیاں لیے ہوئے اپنے محبوب رہنما کے انتظار میں تعریف و ثنا کے گیت گا رہی تھیں۔ عامر نذیر انتخاب ہارنے کے بعد پہلی بار جلسہ کرنے لیاری آیا تھا۔ انہیں یقین تھا کہ وہ دوبارہ اقتدار میں آئے گا تو ان کے چہرے نہیں بھولے گا۔

وہ اسٹیج پر اور ہوشیاری سے پہرا دینے لگا۔ اس کی نظر خاص طور پر اس داڑھی والے پر تھی جو ایک بار پھر اسٹیج کی طرف بڑھنے اور اپنا پارٹی کارڈ دکھا کر کارکنوں کو کچھ سمجھانے کی کوشش کر رہا تھا۔ اسے یقین تھا وہ دشمنوں کا ایجنٹ ہے جو ان کی صفوں میں گھس آیا ہے۔ باوردی نے ایسے لوگوں کے بارے میں خاص طور پر خبردار کیا تھا۔ وہ اس مولوی کا کچھ بندوبست کرنے کے بارے میں سوچ ہی رہا تھا کہ ہوائی فائرنگ میں شدت آ گئی۔ عامر نذیر مقامی رہنماؤں کے نرغے میں قریبی ساتھیوں کے ساتھ پھولوں کے ہار پہنتا، پھولوں کی پتیاں روندتا، استقبالیہ نعروں کے جواب میں دونوں ہاتھ سر سے بلند کر کے ہلاتا اور مسکراتا ہوا اسٹیج کی طرف بڑھ رہا تھا۔ پیچھے پیچھے ڈی ڈی ٹی خان تھا جس کے دانت نکلے ہوئے تھے۔ وہ عامر نذیر کے انداز میں دونوں ہاتھ بلند کیے ہلا رہا تھا اور چاروں طرف اس طرح دیکھ رہا تھا جیسے وہ سب اس کے استقبال کے لیے جمع ہوں۔ تعویذ علی شاہ اپنی وگ سنبھال رہا تھا جو پسینے

کی وجہ سے بار بار سر سے پھسل جاتی تھی۔ پیچھے پیچھے دوسرے رہنما تھے۔ بڑے شاہ صاحب، متین رحیم، رے رے افغانی، ارشد تابانی اور بہت سے دوسرے جنہیں وہ پہچانتا تھا لیکن نام نہیں جانتا تھا۔

وہ اسٹیج پر آنے والی سیڑھیوں پر کھڑا ہوگیا۔ اس نے سوچا اسٹیج پر عامر نذیر سے ہاتھ ملا کر اسے اسٹیج پر خوش آمدید کہے گا۔ لیکن باوردی نے جو عامر نذیر کے لیے راستہ بناتا ہوا آگے آگے آ رہا تھا اسٹیج پر قدم رکھتے ہی اسے اپنے بازو سے ایک طرف کر دیا اور عامر نذیر اور آصفہ کو اسٹیج پر رکھی ہوئی کرسیوں پر بٹھانے لگا۔ دائیں بائیں دوسرے رہنما بیٹھنے لگے تھے۔ جو باقی بچے تھے وہ اطراف میں یا کرسیوں کے پیچھے کھڑے ہو گئے تھے۔ باوردی پیچھے جا کر سب کو دھکے دیتا ہوا عامر نذیر کی کرسی کے پیچھے سر نکال کر کھڑا ہوگیا۔ اخباری فوٹوگرافر فلیش لائٹس چمکا چمکا کر تصویریں اتار رہے تھے۔ باوردی کو پتا تھا جب اخباروں میں تصویریں چھپیں گی تو عامر نذیر کے دائیں بائیں بیٹھے ہوئے لوگ چھانٹ دیے جائیں گے لیکن اس کے درمیان سے نکلا ہوا اس کا سر کوئی نہ کاٹ سکے گا۔ باوردی کو اپنی تصویر اور خبر چھپوانے کا فن آتا تھا۔

وہ باوردی کا دھکا کھا کر اسٹیج کے کنارے کھڑا آنے جانے والے لوگوں کی ٹکروں سے بچ رہا تھا۔ کچھ دیر پہلے تک یہ اسٹیج اس کا تھا۔ سب کی نظریں اس پر تھیں۔ عامر نذیر اور باوردی کے آتے ہی اس کی اہمیت ختم ہوگئی تھی۔ لیکن وہ ہار ماننے والا نہیں تھا۔ وہ اب بھی باوردی کا نائب اور اسٹیج کا انچارج تھا۔ وہ ایک دم اچھلا اور عامر نذیر کے سامنے اسٹیج کے وسط میں آیا اور جیے عامر سدا جیے۔ جیے عامر سدا جیے۔ جیے عامر سدا جیے...... کے نعروں کی لے میں اسٹیج پر ناچنے لگا۔ اسٹیج کے سامنے جو کارکن حفاظتی دیوار بنے ہوئے کھڑے تھے وہ بھی اس کی لے اور بدن کی جنبشوں کا ساتھ دینے لگے۔ جلسہ گاہ میں جیسے کرنٹ دوڑ گیا۔ یہ لیاری کا مجمع تھا جو خالی پیٹ رہ کر ہنسنا اور پھٹے ہوئے کپڑے پہن کر ناچنا جانتا تھا۔ ہاتھ جھنڈوں کی طرح لہرانے اور بدن لٹو کی طرح گھومنے لگے۔ جیے عامر نذیر کے نعرے لَے بن گئے تو خود عامر نذیر بھی جذبات میں بہہ گیا اور کھڑے ہو کر تالیاں بجانے لگا۔ اسٹیج پر سب لوگ کھڑے ہو کر عامر نذیر کی تالیوں کا ساتھ دے رہے تھے۔ عامر نذیر بیٹھا تو رقص بھی تھم گیا اور مجمع تالیاں بجا کر اسے داد دینے لگا۔ تالیاں بند ہوئیں اور شور کم ہوا تو ڈی ڈی ٹی خان نے اٹھ کر اس کی پیٹھ تھپکی اور مائک کی طرف بڑھ گیا۔ تماشا بہت ہو چکا تھا۔ اسے اب جلسے کی کارروائی شروع کرنی تھی۔

وہ اب پھر آسمان پر پہنچ گیا تھا۔ عامر نذیر کے اسٹیج پر ہوتے ہوئے بھی اس نے سب کی توجہ جیتی تھی۔ اسے یقین تھا کہ باوردی اس کی کارکردگی سے بہت خوش ہوا ہوگا۔ عامر نذیر بھی اس کا چہرہ نہ بھولے گا۔ اس کے اور عامر نذیر کے درمیان فاصلہ کم ہو رہا تھا۔ وہ کرسیوں کے پیچھے جا کر باوردی اور اس کے پاس کھڑے ہوئے شخص کے درمیان اپنی گردن گھمانے لگا۔ باوردی نے پلٹ کر اسے دیکھا تو اس کا کان اپنے منہ کے پاس لے آیا۔

''اسٹیج کے نیچے جا کر آس پاس کا خیال رکھو۔ خبر ہے آج سائیں پر حملہ ہوگا۔ ان کی جان کو خطرہ ہے۔ میں اسی لیے ان کے ساتھ چپکا ہوا ہوں۔ کوئی مشتبہ شخص نظر آئے تو پکڑ کر اسٹیج کے پیچھے لے آنا۔ شاباش۔''

اسے یقین ہوگیا کہ باوردی نے اسے اپنا نائب بنانا منظور کرلیا ہے اور اس پر اعتماد کر کے عامر نذیر کی جان اس کے ہاتھ میں دے دی ہے۔ وہ ''یس سر'' کہہ کر اسٹیج کے نیچے کود آیا اور ہر چہرے کو شکاری کی طرح دیکھنے لگا۔ اسے اس داڑھی والے پر شبہ تھا جو لگاتار اسٹیج کی طرف آنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس کی نظریں اسے ڈھونڈنے لگیں۔ اسی وقت ڈی ڈی ٹی خان مائک سے نعرے لگا کر جلسے کو گرم کرنے کے بعد جلسے کا باقاعدہ آغاز کرنے کسی کو قرآن کی تلاوت کے لیے بلانے لگا۔ جس کا نام پکارا گیا تھا وہ اسٹیج کے نیچے کارکنوں کے گھیرے میں تھا۔ ڈی ڈی ٹی خان نے اسے جلدی سے اوپر آنے کا اشارہ کیا۔ داڑھی والے کو روکنے والے کارکن شرمندہ ہوکر راستے سے ہٹ گئے۔ وہ خود بھی دل ہی دل میں شرمندہ ہونے لگا۔ اس کا شبہ غلط تھا۔ یہ تو کوئی اپنا کامریڈ مولوی تھا۔ وہ اسٹیج کے قریب بیٹھے ہوئے لوگوں میں کسی اور مشکوک داڑھی والے کو تلاش کرنے لگا۔

تلاوت کے بعد ڈی ڈی ٹی خان نے جمہوریت اور غریب عوام کی حالت سدھارنے کے لیے کی جانے والی عامر نذیر کی کوششوں کو سراہا، حکومتِ وقت کو گالیاں دیں، وزیرِاعظم ریاض توصیف کے خلاف مردہ باد کے نعرے لگوائے اور رے رے افغانی کو تقریر کرنے کے لیے بلانے لگا۔ رے رے افغانی ابھی مائک تک پہنچا بھی نہیں تھا کہ جلسہ گاہ میں کئی دھماکے ہوئے۔ ہر طرف کثیف دھوئیں کے مرغولے منڈلانے لگے۔ ایک دھماکہ اسٹیج کے پاس ہوا اور اسٹیج بھی دھوئیں کی دیوار کے پیچھے چھپ گیا۔ تڑ تڑ تڑ۔ ہوا میں ایک بار پھر گولیاں چلنے لگیں اور اپنے گھونسلے چھوڑ کر اڑنے والے کئی خوف زدہ

پرندے بھاگتے ہوئے ہجوم کے سروں پر آ گرے۔ دور سے آتی ہوئی پولیس کی موبائل گاڑیوں کے سائرن کی آواز بھی نزدیک آ گئی اور پارک کے بڑے دروازے سے خاکی وردی والے رینجرز کے سپاہی گھس کر مورچہ سنبھالنے لگے۔

کچھ دیر تک اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ کیا کرے۔ پہلے اس نے ''جیے عامر'' کا نعرہ لگا کر بھاگتے ہوئے لوگوں کو روکنے اور جمع کرنے کی کوشش کی لیکن کسی نے ''سدا جیے'' کا جواب نہیں دیا۔ سب میدان سے باہر نکلنے کے لیے راستہ تلاش کر رہے تھے۔ جو کمزور تھے وہ پیروں تلے کچلے جانے کے خوف سے سہم کر اِدھر اُدھر ہو گئے تھے۔ وہ کود کر اسٹیج پر چڑھ گیا۔ اسے عامر نذیر کو بچانا تھا۔ لیکن اسٹیج ویران پڑا تھا۔ عامر نذیر دھماکے کی پہلی آواز سنتے ہی ڈی ڈی ٹی خان اور رے رے افغانی کے ساتھ اسٹیج کے پیچھے سے باہر نکل گیا تھا اور ایک پجیرو میں بیٹھا ہوا کلفٹن میں اپنے گوشۂ عافیت کی طرف رواں دواں تھا۔ دوسرے تمام رہنما بھی ان کے پیچھے پیچھے نکل گئے تھے۔ سب سے آخر میں اطمینان سے سر ہلاتا ہوا باوردی نکلا تھا۔

دھواں آہستہ آہستہ چھٹ گیا۔ وہ اسٹیج پر اب پھر اکیلا تھا۔ چاروں طرف کرسیاں اوندھی پڑی تھیں۔ اس نے پلٹ کر میدان کی طرف دیکھا جہاں ابھی تک ہڑبونگ مچی ہوئی تھی۔ اچانک کہیں سے ٹھاں ٹھاں کرتی ہوئی ٹی ٹی سے اسٹیج کی طرف فائرنگ شروع ہوئی اور کئی گولیاں اس کے سینے اور پیٹ میں گھس گئیں۔ ایک گولی اس کے سینے پر لگی جو عامر نذیر کی تصویر چیرتی ہوئی اس کے دل کے پار ہو گئی۔ اس نے پوری طاقت سے نعرہ لگانے کی کوشش کی۔

''جیے آم......'' لیکن آواز آدھے رستے میں دم توڑ گئی اور وہ دھڑ سے لکڑی کے بنے ہوئے اسٹیج پر گر پڑا۔ داڑھی والے شخص نے جس کی تلاوت سے جلسہ شروع ہوا تھا اسے دور سے اسٹیج پر گرتے دیکھا تو پلٹ کر بھاگتا ہوا اسٹیج پر چڑھ آیا۔ اس نے مدد کے لیے چاروں طرف دیکھا لیکن پہلا شاٹ فائر ہوتے ہی سب بھاگ نکلے تھے۔ داڑھی والے نے اپنی قمیص اتار کر پھاڑی، اس کے سینے پر جہاں سے خون فوارے کی طرح بہہ رہا تھا پٹیاں کسیں اور اسے اپنی کمر پر لاد کر اسٹیج کے پیچھے اس طرف دوڑا جہاں لیڈروں نے اپنی اپنی گاڑیاں پارک کی تھیں۔ سب جا چکے تھے صرف باوردی وہیں تھا لیکن وہ بھی اپنی پجیرو کا انجن سٹارٹ کر چکا تھا۔

''باوردی صاحب! اس کے دل میں گولی لگی ہے۔ اس کا خون نہیں رک رہا۔ اسے فوراً ہسپتال پہنچانا ہے۔'' داڑھی والے نے اسے کمر پر لادے لادے کہا اور دروازہ کھلنے کا انتظار کرنے لگا۔

''سامنے ایدھی کی ایمبولینس کھڑی ہے، اس میں لے جاؤ۔ مجھے سائیں کو دیکھنا ہے۔ ان کی جان خطرے میں ہے۔'' یہ کہہ کر باوردی نے تیزی سے گیئر بدلا اور گاڑی بھگا کر لے گیا۔

ایدھی کی سوزوکی جس پر بڑے بڑے حرفوں میں ایمبولینس لکھا تھا دوسری طرف ذرا فاصلے پر کھڑی تھی۔ وہ انہیں لے کر لیاری کی کچی گلیوں اور ٹوٹی سڑکوں پر اچھلتی ہوئی ہسپتال کی طرف بھاگنے لگی۔ داڑھی والے نے اسے گاڑی کے فرش پر لٹا کر اس کا سر اپنی گود میں رکھ لیا اور اسے جگانے کی کوشش کرنے لگا۔ اچانک ایمبولینس بہت زور سے اچھلی۔ اس کا پہیہ شاید کسی گڑھے سے ٹکرایا تھا۔ اس نے آنکھیں کھول دیں اور کچھ کہنے کی کوشش کرنے لگا لیکن زبان نے ساتھ نہیں دیا اور اس کی گردن ایک طرف کو ڈھلک گئی۔

''اناللہِ وانا الیہ راجعون!'' داڑھی والے نے اس کی نبض ٹٹولنے کے بعد کہا اور اس کی آنکھیں بند کرنے لگا۔ بند ہونے سے پہلے اس کی آنکھوں سے امید پھدک کر باہر نکل آئی اور ایمبولینس سے کود کر کسی انجانی منزل کی طرف چل دی۔

کلفٹن میں اپنے گھر کے بڑے سے کشادہ لاؤنج میں عامر نذیر بیٹھا ڈی ڈی ٹی خان اور رے رے افغانی پر برس رہا تھا۔

''آپ لوگ اب تک مرنے اور زخمی ہونے والوں کی تعداد معلوم نہیں کر سکے۔ باہر پریس انتظار کر رہا ہے۔ انہیں کیا بتاؤں گا؟ مجھ پر بھرے جلسے میں قاتلانہ حملہ ہوا اور ایک آدمی نہیں مرا؟ اخبار والے میرا مذاق اڑائیں گے۔ اگر وہ سب دھویں کے بے ضرر بم تھے تو میرے کارکن کو لگنے والی گولی کہاں سے آئی تھی۔ یا وہ گولیاں بھی بلینک تھیں؟''

''اس لڑکے کا پتا نہیں چل رہا۔ شاید ایدھی والے اسے سول ہسپتال لے گئے ہوں، لیکن وہاں کا فون نہیں مل رہا۔'' رے رے افغانی نے ڈرتے ڈرتے کہا۔ ڈی ڈی ٹی خان کی انگلیاں اور تیزی سے فون نمبر گھمانے لگیں۔

''باوردی کہاں ہے؟'' اسی وقت باوردی کمرے میں داخل ہوا۔ اس کا چہرہ جوش سے تمتما رہا

تھا۔ عامر نذیر اسے سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگا۔

''پورے شہر میں آگ لگا کر آیا ہوں۔ شیر شاہ میں لکڑیوں کی ٹال پھونک دی ہے۔ لیاری میں ایک بس جلا دی ہے۔ پرانے ٹائر جلا کر لیاری کی ایک ایک گلی اور ہر دکان بند کرا دی ہے۔''

''لیاری۔ لیاری۔ لیاری......!'' عامر نذیر غصے سے چیخا۔ ''مجھے لیاری نہیں برنس روڈ میں آگ چاہیے۔ لالوکھیت، ناظم آباد، گلشن اقبال اور کلفٹن میں آگ چاہیے۔''

''ٹھیک ہے سائیں۔'' باوردی نے کہا اور مڑ کر واپس جانے لگا۔

''کہاں جا رہے ہو؟''

''برنس روڈ۔ لالوکھیت، ناظم آباد......''

''بیٹھ جاؤ بے وقوف!'' عامر نذیر نے بے بسی سے سر ہلایا اور دوسری طرف بیٹھے ہوئے لوگوں سے مخاطب ہوا۔ ''تعویذ شاہ، متین رحیم، شاہ صاحب! آپ لوگ آج رات ہی اپنے اپنے علاقوں میں نکل جایئے اور دیکھیے سندھ میں کیا ہو سکتا ہے۔ میں جا کر پنجاب کو سنبھالتا ہوں۔ ریاض توصیف کے خلاف مہم شروع کرنے کا یہ بہترین موقع ہے۔''

''جی سائیں!'' تعویذ علی شاہ فوراً اچھل کر کھڑا ہو گیا لیکن عامر نذیر اسے بیٹھ جانے کا اشارہ کرنے لگا۔

''باوردی باہر دیکھ کر آؤ کون کون آ گیا ہے۔''

''میں دیکھتا ہوا آیا ہوں۔ سب اخبار والے آ گئے ہیں۔ اے پی، اے ایف پی اور بی بی سی والے بھی ہیں۔ زی ٹی وی کا کیمرہ بھی پہنچ گیا ہے۔''

''گڈ۔ رے رے! اٹلانٹا فون کر کے رز خان سے بات کرو۔ مجھ پر قاتلانہ حملے کی خبر سی این این کے ہر بلیٹن میں آنی چاہیے۔ واشنگٹن فون لگاؤ۔ امریکہ سے کسی کا بیان آنا ضروری ہے۔ گلستان سے کہہ دو لندن میں......'' اسی وقت ڈی ڈی ٹی خان کو سول ہسپتال کی لائن مل گئی اور عامر نذیر خاموش ہو کر اسے دیکھنے لگا۔

''میں سابق وفاقی وزیر پروفیسر ڈی ڈی ٹی خان بول رہا ہوں۔ ایمرجنسی ملایئے۔ فوراً...... ایمرجنسی؟...... میں سابق وفاقی وزیر پروفیسر......''

''کام کی بات کرو۔'' عامر نذیر غصے سے چیخا۔

''ہمارا ایک کارکن گولی لگنے سے زخمی ہوا تھا۔ وہ ایمرجنسی میں ہے۔اس کی خیریت بتائیے۔'' ڈی ڈی ٹی خان نے پسینہ پونچھتے ہوئے کہا۔ وہ اس وقت سب کی نگاہوں کا مرکز تھا۔

''جی؟...... مر گیا...... رستے ہی میں مر گیا تھا؟...... آپ کو یقین ہے؟...... تھینک یو ڈاکٹر۔ تھینک یو۔!'' ڈی ڈی ٹی خان کا چہرہ خوشی سے چمکنے لگا۔ وہ فون رکھ کر پلٹا تو اسے خبر دہرانے کا موقع نہیں ملا۔ عامر نذیر پہلے ہی اٹھ کر دروازے کی طرف جاچکا تھا۔ اسے پریس کانفرنس کرنی تھی۔ اسے پتا تھا اگر دیر ہوگئی تو بی بی سی کی خبروں کا وقت نکل جائے گا۔ ڈی ڈی ٹی خان بھی تیزی سے اس کے پیچھے پیچھے بھاگا۔

''...... میرے کارکن مجھے مرنے نہیں دیں گے۔'' عامر نذیر پریس کانفرنس میں گرج رہا تھا۔ ''وہ ریاض توصیف کی گولیوں کے سامنے آہنی دیوار بن جائیں گے۔ ان کی قربانیاں رائیگاں نہیں جائیں گی۔ میں اس ملک کے غریبوں کی آخری اُمید ہوں۔ آخری اُمید......''

فوٹوگرافروں کی فلیش لائٹوں میں چمکتا ہوا عامر نذیر کا چہرہ غصے سے سرخ ہوگیا تھا۔ صحافیوں کے ٹیپ ریکارڈر پوری رفتار سے کام کر رہے تھے۔ کاغذوں پر ان کے قلم تیزی سے چل رہے تھے اور سہمی ہوئی امید پاؤں تلے کچلے جانے کے ڈر سے پھدکتی ہوئی کمرے سے باہر نکلنے کا راستہ ڈھونڈ رہی تھی۔

(ناول ''وزیراعظم'' سے اقتباس)

نواب ٹُن کا عجائب گھر

نواب ٹُن کی رزم گاہ اچھا خاصا عجائب گھر تھی۔ جس دن کوئی نیا مہمان آ تا یا درباریوں کی حاضری زیادہ ہوتی، نواب ٹُن ان یادگاروں کے سنگ میل پھلانگتا ہوا تاریخ کے سفر پر نکل پڑتا۔ ہر یادگار سے ایک کہانی جڑی ہوئی تھی۔ کہانی کے بغیر کوئی چیز کتنی نادر کیوں نہ ہو، نواب کے لیے بیکار تھی۔ جلالی کو یقین تھا نواب نوادرات کے بہانے کہانیاں خریدتا تھا۔ اسے حیرت تھی نواب ٹُن ایک دولت مند تاجر کیسے بن گیا تھا۔ اسے تو مؤرخ، محقق، شاعر اور اس کے نتیجے میں خراب حال ہونا چاہیے تھا۔

فرش پر گدیلی نشستوں کے ساتھ جو تکیے تھے ان پر سندھی کام کے بہت خوبصورت غلاف چڑھے ہوئے تھے۔ نواب ٹُن کے بقول یہ غلاف صحرائے تھر کی کنواری لڑکیوں نے اپنے زانوؤں پر رکھ کر رات رات بھر چاند کی روشنی میں بیٹھ کر بنائے تھے۔ نواب کا دعویٰ تھا اس نے صحرائی ریت میں چاندنی کا یہ حسن تھر جا کر اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔

''ان کی تو نظریں تک کنواری ہیں۔ پلکوں کے جھروکوں سے کسی کو جھانک کر نہیں دیکھتیں، بس نظروں کا سارا کمال ٹانکوں میں پرو دیتی ہیں۔ ہر ٹانکا پلک کے برابر ہے۔ ناپ کر دیکھ لو۔ جس کو یقین نہ ہو تھر جا کر پیمائش کر لے۔''

نواب ٹُن کا چیلنج سن کر سب سیدھے ہو کر بیٹھ جاتے کہ کہیں پلک کا خم دار خنجر کسی کی کمر میں نہ

چبھ جائے۔نواب زیادہ پی کر نشے میں نہیں آتا،بس جذباتی ہو جاتا تھا۔ایک رات جب پورا چاند تھا،وہ چاندنی رات کا مزا لینے تکیہ اٹھا کر چھت پر لے گیا۔واپس آیا تو رو رہا تھا۔

''ہرنا نکے پر ایک ایک آنسو بیٹھا چمک رہا تھا۔'' چاندنی رات نے جو بصیرت دی تھی اس پر تھر کی کنواریوں کو دیر تک اپنے اشکوں کا خراج دیتا رہا۔

ایک کونے میں لکڑی کی تپائی پر نارووال کی بنی ہوئی چکنی مٹی کی ہانڈی سجی ہوئی تھی۔

''کیا یہ بھی کسی کنواری کمہارن نے اپنے زانوؤں پر رکھ کر بنائی تھی؟'' چچا صدیقی نے ہنس کر پوچھا تو نواب ٹُن کو غصہ آ گیا۔

''یہ کنواری مٹی کی ہانڈی ہے چچا کنواری مٹی کی۔جاؤ مٹی میں نہا کر آؤ۔کمہارن کی طرح تم بھی پارسا ہو جاؤ گے۔''

اس کے ساتھ ہی انہیں اپنی کمہارن محبوبہ یاد آ گئی۔جام ڈبل ہو کر پٹیالہ ہو گیا اور نواب ٹُن جذباتی۔تاریخ اور ثقافت کا سفر اس روز وہیں ختم گیا تھا۔

مٹی کی ہانڈی کے ساتھ ایک تپائی پر اونٹ کی کھال کے رنگین شیڈ والا ایک قدیم ٹیبل لیمپ رکھا تھا۔یہ لیمپ آج کل نواب ٹُن کو شرمسار کرنے لگا تھا۔لیمپ خرید کر نواب بہت خوش ہوا تھا۔کسی نے یہ کہہ کر اسے بیچا تھا کہ اس کا شیڈ اس اونٹ کی کھال کا بنا ہوا ہے جس نے اپنے غیرت مند سوار کے ساتھ جان دے دی تھی۔کوٹ ادو میں کوئی ایک سو برس پہلے مرزا جٹ کے خاندان کا ایک نوجوان ''غیرت کا قتل'' کر کے ملتان بھاگ گیا تھا۔وہ مہینوں اس شہید اونٹ کی پیٹھ پر بیٹھا صحرا صحرا بھٹکتا پھرا اور پھر اسی صحرا نوردی میں بھوک پیاس کے ہاتھوں یا شاید کسی سانپ کے کاٹے سے اونٹ کے ساتھ خود بھی مر گیا تھا۔نواب ٹُن نے اس لیمپ کو بہت اونچا مقام دیا تھا۔جب وہ رزم گاہ کی ساری بتیاں بند کر کے لیمپ میں لگا ہوا سرخ بلب روشن کرتا تو اس کی آنکھوں میں خون اتر آتا۔دل ''غیرت کا قتل'' کرنے پر اکساتا۔لیکن غیرت جگانے والا کوئی وسیلہ نہیں تھا۔

''سوچ رہا ہوں ایک نوجوان نوکرانی رکھ لوں۔تم لوگ اس پر بری نگاہ ڈالو گے اور میرے ہاتھوں مارے جاؤ گے۔'' یہ حل نوجوان نوکرانی رکھنے کی حد تک سب دوستوں کو پسند آیا تھا۔

نواب کو یقین تھا کہ اونٹ کا تعلق صاحباں کے خاندان سے ہوگا۔ابھی یہ تحقیق مکمل نہیں ہوئی

تھی کہ لیمپ نواب کی نظروں سے گر گیا۔ نوادرات بیچنے والے کسی دوسرے تاجر نے نواب ٹمن کو بتایا تھا کہ لیمپ سے وابستہ یہ کہانی غلط تھی۔ اس نے ایک اور کہانی سنائی تھی جس کے مطابق وائسرائے ہند نے گیلانیوں، گردیزیوں، قریشیوں، لغاریوں اور دوسرے جاگیرداروں کو انگریز سرکار کی خدمت کرنے پر انعام واکرام دینے کے لیے ملتان میں دربار لگایا تھا۔ اس موقع پر اونٹ کی کھال کا ایک نقشین ہیٹ وائسرائے کو پیش کیا گیا تھا جو بعد میں انگریز کے کانگریسی خانساماں نے چوری کر کے بیچ دیا تھا۔ کسی کاریگر نے ہیٹ کو لیمپ کے شیڈ میں بدل کر اس سے وہ کہانی جوڑ دی تھی۔

دونوں کہانیوں کی صداقت کے بارے میں سب کو شبہ تھا۔ لیکن نواب ٹمن کے لیے لیمپ داغ دار ہو چکا تھا۔ اسے سخت غصہ آیا تھا اور اس نے لیمپ کا برقی سلسلہ منقطع کر کے اسے تپائی سے اتار کر زمین پر رکھ دیا تھا۔ تپائی کا اونچا مقام زمین پر رکھی ہوئی مٹی کی ہانڈی کو مل گیا تھا۔ لیمپ پر جب بھی نظر پڑتی نواب کا خون کھولنے لگتا۔

''اٹھا کر پھینک کیوں نہیں دیتے؟'' چچا صدیقی نے مشورہ دیا تھا۔

''کیسے پھینک دوں۔ اس لیمپ کی روشنی نے میری تاریخ کے ہر صفحے کو تاریک کر رکھا ہے۔ کس کس ورق کو نوچ کر پھینکوں۔ دو چار ورق باقی بچیں گے صرف دو چار ورق!''

نواب ٹمن پر جب بھی شرمندگی کا دورہ پڑتا وہ لیمپ سے نگاہیں بلند کرتا اور دیوار پر ٹنگے ہوئے بلوچی خنجر پر نظریں جما کر اپنا احساسِ شرمندگی دور کرنے کی کوشش کرتا۔ ڈیڑھ سو سال پہلے قاسو نامی ایک بلوچی نے اس خنجر سے اس انگریز کو قتل کر دیا تھا جو قلات میں بلوچوں کو آپس میں لڑانے کی سازش کر رہا تھا۔ ایک روز نواب کا کوئی دوست اپنے امریکی مہمان کو نواب کے نوادرات دکھانے لے آیا تھا۔ نواب نے اس خنجر کو ہاتھ تک نہیں لگایا تھا اور سارا وقت طاق میں رکھے ہوئے اس پیالے سے وابستہ کہانیاں سناتا رہا جس میں روایت کے مطابق شیر شاہ سوری قہوہ پیا کرتا تھا۔ یہ رنگین پیالہ جس میں لوہے کے بہت سے ٹانکے لگے ہوئے تھے پانچ سو سال پرانا تھا۔ کم از کم پیالہ بیچنے والے بڈھے افغان کا یہی دعویٰ تھا۔ افغان کے مطابق اس نے یہ پیالہ ایک کاریگر سے خریدا تھا جسے ٹکڑوں کی شکل میں یہ پیالہ ہوتی خاندان والوں نے جوڑنے کے لیے دیا تھا اور پھر لے جانا بھول گئے تھے۔ ہوتیوں کو یہ پیالہ ہندوستان پر حکمرانی کرنے والے انگریز افسروں میں سے کسی نے دیا تھا۔ ہوتیوں نے اس انگریز کو جو 1857ء کی

جنگ آزادی کے مجاہدین سے بچنے کے لئے چھپا چھپا پھر رہا تھا پناہ دی تھی۔ انگریز نے یہ پیالہ ایک خاندانی بٹلر سے لیا تھا جس کے آباؤ اجداد میں سے کوئی شیر شاہ سوری کا ملازم تھا جس نے یہ پیالہ شیر شاہ کے خیمے سے چرایا تھا۔ انگریز نے اپنی جان بچانے والے ہوتیوں کو پیالہ دے کر کہا تھا۔ ''آج یہ امانت اس کے صحیح حق داروں کے پاس پہنچ گئی۔''

امریکی مہمان کے جانے کے بعد نواب ٹمن نے اطمینان کا سانس لیا اور دیوار سے خنجر کو اتار کر اپنے ہاتھ میں لے لیا تھا۔

''شیر شاہ کے اس پیالے نے آج پھر ایک انگریز کی جان بچالی۔'' اس نے دوسرے ہاتھ سے پیالہ اٹھا کر انگلیوں پر گھماتے ہوئے کہا۔ ''یہ نہ ہوتا تو قاسو کا خنجر آج ایک اور 'لبدین' کے سینے میں اتر جاتا۔''

اس کے بعد نواب ٹمن کو اس بات پر فخر ہونے لگا تھا کہ اس کے نوادرات کا ذخیرہ تاریخی طور پر کتنا متوازن ہے۔ کسی نے توجہ دلائی کہ غیر ملکی مہمان انگریز نہیں امریکی تھا۔

گو واں کے نہیں پہ واں کے نکالے ہوئے تو ہیں

نواب نے مصرعہ پڑھ کر لاپرواہی سے سر ہلا دیا تھا۔

خنجر کے سر پر ایک زنگ آلود برہنہ تلوار لٹک رہی تھی جس سے پانی پت کی لڑائی میں احمد شاہ ابدالی کے ایک سپاہی نے کسی مرہٹہ سردار کا سر اڑا دیا تھا۔ ایک دوست کسی ہندو مہمان کو ساتھ لایا تو اس نے آتے ہی وضاحت کر دی یہ مرہٹہ نہیں ٹھٹھہ کے سندھی ہیں۔

''کوئی فرق نہیں پڑتا!'' نواب نے یہ کہہ کر ایک خوبصورت سے چھینکے میں لٹکے ہوئے گوتم بدھ کے سر پر نظریں جما دی تھیں۔ دو ہزار سال پرانی یہ مورتی کسی نے ٹیکسلا کے میوزیم سے چرا کر نواب ٹمن کو بیچی تھی۔ یہ مورتی چندرا نے نروان حاصل کرنے کی خاطر دو ہزار سال پہلے ٹیکسلا کے ایک اسٹوپا میں چڑھائی تھی۔

''چندرا کے نام پر میں نے مرہٹوں کے سارے گناہ معاف کر دیئے ہیں۔'' اس نے کہا تھا اور آثار قدیمہ کے کسی ایسے ماہر کا پتہ پوچھنے لگا تھا جو یہ کھوج لگا سکے کہ اس زمانے میں چندرا کی عمر کیا ہوگی۔ شکل وصورت کیسی ہوگی۔

''دو ہزار سال پرانی عورت کے خدوخال جان کر کیا کرو گے!'' ایک دوست نے کہا تھا۔
''تم کیا جانو۔ کبھی عشق کے کیپسول میں بیٹھ کر دیکھو۔ ہزاروں برس کا سفر لمحوں میں طے ہو جاتا ہے۔ لمحوں میں۔'' نواب ٹُن نے سرد آہ بھر کر کہا۔ ویسے نواب ٹُن کو گوتم بدھ سے سخت شکایت تھی۔
''عجیب سی میٹھی مسکراہٹ ہے۔ جب سے اس مسکراہٹ کو دیکھا ہے کہ کسی دشمن سے نفرت کرنے کو دل ہی نہیں چاہتا۔''

نواب ٹُن کی پنجہ آزمائی صرف تاریخ اور پرانی تہذیبوں سے نہیں تھی، اس کی رزم گاہ میں کھیلوں کے میدان کی وسعت بھی سمائی ہوئی تھی۔ ایک کونے میں لکڑی کے دو بھاری مگدر کھڑے تھے جنہیں رستم زماں گاما پہلوان سر کے گرد گھما کر اپنے بازوؤں کے پٹھے مضبوط کرتا تھا۔ ہر مگدر کے گلے میں باکسنگ کا ایک ایک دستانہ ہار کی طرح لٹکا ہوا تھا۔ یہ دستانے پہن کر محمد علی کلے نے سونی لسٹن کو شکست دی تھی۔ اسی طرح کرکٹ کے دو چھوٹے چھوٹے بلّے لٹکے ہوئے تھے۔ ایک پر عمران خان کے اور دوسرے پر جاوید میانداد کے آٹو گراف تھے۔ دونوں نے یہ بلّے نواب ٹُن کو ذاتی طور پر دیے تھے۔ کراچی میں فسادات بڑھ گئے تو دونوں بلّوں کو اتار کر ایک ساتھ کھڑا کر دیا تھا۔ کہا تھا کہ قوم کو متحد کرنے کی کوشش کر رہا ہوں۔ گو اس ٹونکے نے کام نہیں کیا تھا لیکن نواب ٹُن مایوس نہیں ہوا تھا۔ کہتا تھا کبھی نہ کبھی بلّوں کا یہ اتحاد کام دکھائے گا۔

ایک کونا ادبی تاریخ کا حصہ تھا۔ ایک سادہ سا دیہاتی حقہ جو علامہ اقبال کا خادم علی بخش پیا کرتا تھا اور جسے نواب ٹُن نے بہت منت سماجت کر کے فقیر فیملی سے حاصل کیا تھا۔ کونے میں سجاوٹی چیزیں رکھنے والی میز پر شاعری کی تاریخ سجی تھی۔ وہ ٹوپی رکھی تھی جو سبحانی بایونس نے ''مرزا غالب بندر روڈ پر'' کے کھیل میں مرزا غالب بن کر پہنی تھی۔ نواب ٹُن کو اس بات کا بہت صدمہ تھا کہ اس کے پاس ایسی کوئی چیز نہیں تھی جس کا براہ راست غالب سے تعلق ہو۔ تلاش میں دہلی کا چکر لگایا تھا۔ گلی قاسم جان کے اس مکان تک بھی پہنچ گیا تھا جہاں غالب رہا کرتے تھے۔ وہاں ڈرائی کلینرز کی ایک دکان کھلی تھی۔ ایک آدمی سے جو کپڑوں پر استری کر رہا تھا پوچھا تھا۔ ''کیا غالب کا مکان یہی ہے؟''
''کام کیا کرتا ہے؟'' یہ جواب سن کر نواب ٹُن مزید کچھ کہے سنے بغیر واپس چلا آیا تھا۔
کمرے میں چھوٹا سا ایک کلاک بھی رکھا تھا جس کی سوئیوں کی گردش کے ساتھ جوش ملیح آبادی

اپنا پیمانہ بھروایا اور خالی کیا کرتے تھے۔ ساتھ میں کرسٹل کا ایک گلاس تھا جس میں نواب مُن نے ایک بار فیض احمد فیض کو ڈرنک بنا کر دی تھی۔ اسی کے ساتھ ایک چھوٹا سا گلاس تھا جس میں پانی ڈال کر احمد فراز نے اپنے سگریٹوں کے فلٹر بھگوئے تھے۔

''تمہارے ادبی کونے میں کوئی نثر نگار نہیں ہے۔'' جلالی نے شکایت کی تھی۔

''یار نثر نگاروں کا احترام کیا جاتا ہے ان سے شاعروں کی طرح پیار نہیں کیا جاتا۔ شاعروں سے دل کا رشتہ ہوتا ہے۔ وہ ہماری محبتوں کے راز دار ہوتے ہیں۔ دل کی دھڑکنوں کو ان کے شعروں کی زبان ملتی ہے تو جذبے بالغ ہونے لگتے ہیں۔ کوئی پاس نہ ہو پھر بھی سامنے آ کھڑا ہوتا ہے۔ تم نے کبھی تجربہ کیا ہے؟'' جلالی نے مسکرا کر نفی میں سر ہلایا تو نواب مُن نے جھوم جھوم کر شعر پڑھنے شروع کر دیے تھے۔ تیسری غزل اور چوتھے جام کے بعد آنکھیں بند ہونے لگیں تو جلالی کو جانے کا اشارہ کر دیا تھا۔

''بس اب چلے جاؤ۔ میرے گرد ہجوم اکٹھا ہو گیا ہے۔''

(ناول ''وزیراعظم'' سے اقتباس)

شرابی

نیویارک کا موسم بھی عجیب تھا۔ پارک ایونیو تک پہنچتے پہنچتے اچانک بوندا باندی شروع ہوئی اور پھر بارش میں بدل گئی۔ کچھ دیر پہلے تک دھوپ نکلی ہوئی تھی اس لیے ساحل نے چھتری نہیں لی تھی۔ 45ویں اسٹریٹ تک بھاگ کر پہنچا اور جب شیف میں داخل ہوا تو کافی بھیگ گیا تھا۔ اندر آ کر دیر تک اپنا سر ہلا کر بالوں سے پانی جھٹکتا رہا۔ دروازے میں داخل ہوتے ہی بائیں ہاتھ پر بڑا سا کاؤنٹر تھا جس کے پیچھے ایک فربہی مائل عورت ساقی گری کر رہی تھی۔ اندر کی طرف کھانے کی میزیں تھیں جو سب خالی تھیں۔ بار کاؤنٹر پر دو تین لوگ تھے۔ کونے پر بیٹھا ہوا ایک شخص جس نے بارٹینڈر کے گال پر چٹکی بھر کر قہقہہ لگایا تھا، یقیناً طاہر تھا۔ اسی وقت طاہر نے دروازے میں کھڑے ساحل کو دیکھا اور اسٹول سے اتر آیا۔ وہ لمبے قد اور گندمی رنگ کا جامہ زیب شخص تھا۔ یورپی تراش کا گہرے رنگ کا سوٹ پہنے تھا۔ ابھی ٹائی کی گرہ ڈھیلی نہیں ہوئی تھی۔

''تم یقیناً ساحل ہو۔'' اس نے ہاتھ لہراتے ہوئے کہا۔ ساحل نے اثبات میں سر ہلایا تو گلے ملنے لگا۔

''نیویارک میں جب ہم کسی سے ملتے ہیں تو پہلا سوال پوچھتے ہیں، دن کیسا گزرا۔''

''ٹھیک!''

''صرف ٹھیک؟ تم مجھ سے پوچھتے تو میں کہتا، پردہ اٹھتا ہے، پردہ گرتا ہے، یہی پورے دن کی کہانی ہے۔ مجھے مکالمے جمع کرنے اور بولنے کا شوق ہے۔''

ساحل خاموشی سے طاہر کے ساتھ ایک اسٹول پر بیٹھ گیا تو بارٹینڈر ان کی طرف متوجہ ہوگئی۔

''میرے دوست سے ملو۔ ڈاکٹر ساحل فرام این وائی یو۔ اور یہ ہے پولا، پرتگالی شراب! دی گریٹ بارٹینڈر۔'' طاہر نے بارٹینڈر کا گال نوچتے ہوئے کہا۔

''کیا پیو گے؟'' پولا نے طاہر کا خالی ہونے والا گلاس دوبارہ بھرتے ہوئے پوچھا اور ساحل کے بتانے پر اسے کوک کا گلاس دے کر دوسرے گاہک کی طرف چلی گئی۔

''سیّد نے بتایا تھا تم نہیں پیتے۔ بہت اچھا کرتے ہو۔'' طاہر نے بڑا سا گھونٹ لے کر منہ بناتے ہوئے کہا۔ ''یہ اچھی چیز نہیں ہے۔ کڑوی، بدمزہ، کنگال کرنے اور گھر توڑنے والی کمینی بدذات! رات کو گھر جاؤ تو بیوی سے لڑو، صبح اٹھو تو ہینگ اوور، دفتر آؤ تو موڈ خراب۔''

''پھر آپ کیوں پیتے ہیں۔''

''عادت! چھٹتی نہیں ہے منہ سے یہ کافر لگی ہوئی۔ پہلے میں پیتا تھا، اب یہ مجھے پیتی ہے۔ یہ ذرا فلمی قسم کا مکالمہ ہے۔ شراب کا مسئلہ یہ ہے کہ اس سے متعلق ہر مکالمہ فلم میں بولا جا چکا ہے۔ ایک نہ ایک دن میں کوئی اوریجنل مکالمہ ضرور تلاش کروں گا۔''

''یقیناً، لیکن آپ مجھے ڈاکٹر نہ کہیں۔ میری پی ایچ ڈی ابھی مکمل نہیں ہوئی۔''

''ہو جائے گی۔ ہو جائے گی۔ ہمارے لیے تم ابھی سے ڈاکٹر ہو۔ دیکھو تردیدمت کرنا۔''

ساحل نے کچھ نہیں کہا۔ پولا طاہر کا خالی کیا ہوا گلاس پھر بھر کر چلی گئی۔

''سیّد نے کہا تھا آپ لوگ امن کے لیے مظاہرہ کر رہے ہیں؟''

''جی ہاں!'' مطلب کی بات سن کر ساحل کو خوشی ہوئی۔ اس نے مظاہروں کے پمفلٹوں کا ایک موٹا بنڈل بیگ سے نکال کر طاہر کو دیا۔

''یار یہ سیّد بھی گریٹ آدمی ہے۔'' طاہر نے پمفلٹ دیکھے بغیر کاؤنٹر پر رکھ دیے۔ ''گریٹ جرنلسٹ، گریٹ ایڈیٹر۔'' اسی وقت طاہر کے موبائل فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ اس کی بیوی کا فون تھا۔

''ڈارلنگ! میں آج دیر سے آؤں گا، آج میری ڈاکٹر ساحل سے میٹنگ ہے۔ تم ڈاکٹر ساحل

کونہیں جانتیں؟ ڈاکٹر آف فلاسفی، دی گریٹ پولیٹیکل سائنٹسٹ فرام این وائی یو......ٹھیک ہے میں دودھ لیتا آؤں گا۔ بائی ڈول!''

طاہر نے فون بند کر کے تازہ بھرے ہوئے گلاس سے ایک چھوٹا سا گھونٹ لیا۔ کچھ دیر تک لگا جیسے کہیں کھو گیا ہو، لیکن فوراً ہی واپس آ گیا۔

''تمہارے نام سے لگتا ہے شاعری بھی کرتے ہو۔''

''جی ہاں! کبھی کبھی۔''

''تم غزل تو نہیں کہتے؟''

''نہیں! کبھی نہیں۔''

طاہر نے اسٹول سے اتر کر ساحل کو گلے لگا لیا۔ ''تم واقعی گریٹ ہو۔ مجھے غزل سے سخت چڑ ہے۔''

''کیوں؟''

''مجھے جھوٹ سے نفرت ہے اور غزل سراسر جھوٹ ہے۔ ڈھٹائی کے ساتھ سرِ عام آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا جانے والا سفید جھوٹ!''

''جھوٹ؟ لیکن کیوں؟ محبت تو دنیا کا سب سے بڑا سچ ہے۔''

''سچ بول کون رہا ہے وہ جو اپنی تاریک سرنگ سے باہر نہیں نکلے۔ جنھوں نے عشق کی کوئی منزل سر نہیں کی، حسن کو چھو کر نہیں دیکھا، جن سے ان کی بیوی کے سوا کسی نے وفا یا بے وفائی نہیں کی جو میخانے جا کر لڑکھڑائے نہ کسی تحریک اور انقلاب کا حصہ بنے۔''

طاہر ایک لمحے کو سانس لینے کے لیے رکا۔ ساحل اس کے چہرے کے تاثرات سے اندازہ کر سکتا تھا کہ اب جو مکالمہ آئے گا وہ تھیٹریکل انداز میں ادا ہوگا۔ اس کا خیال غلط نہیں تھا۔

''دل کو پری خانہ بنائے بغیر کہی جانے والی غزل خالی ڈھول ہے۔''

''آپ چاہتے ہیں کہ شاعر حسین عورتوں کے پیچھے بھاگتا پھرے، بے وفائی کا سلسلہ دراز کرے، شراب خانے کو گھر بنائے پھر جا کر غزل کہے۔ طاہر بھائی! شاعر کا جسم نہیں تخیل پرواز کرتا ہے۔ غزل اسی تخیل کی پیداوار ہے، کوئی عملی تجربہ نہیں!''

''میرے پاس بہت سے شاعروں کی کتابیں ہیں۔ سب کے فلیپ پر لکھا ہے ان کی شاعری، مشاہدے اور تجربے کی شاعری ہے۔ یہ مشاہدے اور تجربے کی شاعری نہیں، ان کی حسرتوں کا نوحہ ہے۔ Masturbation! خودلذتی کا تہذیبی پرچار! واہ کیا جملہ کہا ہے، داد دو ڈاکٹر!''

''سبحان اللہ!''

''میں صرف ایک بار نیو یارک کے مشاعرے میں گیا تھا۔'' غزل کے خلاف طاہر کی تقریر جاری تھی۔ ''شیروانی اور سر پر رام پوری ٹوپی پہنے سفید داڑھی والا ایک شاعر جگر کے ترنم کی نقل کر رہا تھا۔ وہ شراب پر شعر پڑھتے ہوئے اس طرح جھوما تھا جیسے میخانہ سر پر اٹھا رکھا ہو۔ اس کی آنکھوں میں اتنی حسرتیں دفن تھیں اور اتنی تشنگی تیر رہی تھی کہ دل چاہا اس کا ہاتھ پکڑ کر کھینچتے ہوئے شیف لے آؤں، جام پلاؤں اور کہوں اب کہہ غزل!''

ساحل بے ساختہ ہنس پڑا۔ اس نے غزل کا اتنا پُر جوش مخالف پہلے نہیں دیکھا تھا۔

''یہ ہنسنے کی بات نہیں۔ رونے کا مقام ہے۔''

غزل کے خلاف طاہر کی تقریر اچانک رک گئی۔ وہ اسٹول سے اتر کر تیزی سے دروازے کی طرف بڑھا اور اس شخص کو سنبھالنے لگا جو لڑکھڑاتا ہوا بار میں داخل ہوا تھا۔ اس کا رنگ گورا اور سر اور داڑھی کے بال سفید تھے۔ ساٹھ سے کم کا نہیں تھا۔ اسی کے ساتھ گہرے سانولے رنگ کا ایک شخص داخل ہوا تھا اور طاہر سے مل کر داڑھی والے شخص کی برساتی اتارنے میں مدد کر رہا تھا۔

''طاہر! تو ڈائیلاگ جمع کرتا ہے نا!'' نووارد نے اسٹول پر بیٹھ کر ایک ڈبل پیگ کا آرڈر دیتے ہوئے کہا۔ ''اپنا بھی ایک ڈائیلاگ سنبھال۔ ایک کل گزر گیا، ایک کل ابھی نہیں آیا، آج کی فکر کر اسے برباد نہ کر، بول کیسا ہے۔''

''واہ! واہ یار واہ! تو نے کمال کر دیا۔'' طاہر سر دھنتے اور غٹ غٹ کر کے اپنا گلاس خالی کرنے لگا۔ اسے اچانک ساحل کا خیال آیا۔

''میرے دوست سے ملو۔ ڈاکٹر ساحل۔ گریٹ پولیٹیکل سائنٹسٹ فرام این وائی یو۔ یہ شاعر بھی ہیں۔'' ساحل یہ سوچ کر دل ہی دل میں ہنس پڑا کہ طاہر کے ہر نئے پیگ کے ساتھ ساحل کی عظمت میں اضافہ ہو رہا تھا۔ ''یہ ہے راج سیٹھی، دی گریٹ آرکیٹیکٹ۔ نیو یارک کے سیوریج سسٹم پر کام کر رہا

ہے۔اسی لیے روز نالی میں گرتا ہے۔'' طاہر نے قہقہہ لگایا اور راج کے ساتھ آنے والے دوسرے شخص کا تعارف کرانے لگا جو طاہر ہی کی طرح مہنگا بزنس سوٹ پہنے ہوئے تھا۔ ''یہ اے ڈبلیو خان ہے، عبدالوہاب خان فرام ڈھاکہ! ہم اسے صرف ڈبلیو کہتے ہیں، یہ بینکر ہے، گریٹ بینکر۔ ہر وقت پیسوں میں کھیلنے والا۔'' ساحل سوچنے لگا آس پاس کوئی ایسا بھی ہے جو گریٹ نہ ہو۔

''گریٹ آرکیٹکٹ بکواس! سپر پاور مائی فٹ!'' راج نے جو پہلے سے پیے ہوئے تھا، گلاس سے ایک گھونٹ لے کر کہا۔ ''آرکیٹکچر دیکھنا ہے تو پانچ ہزار سال پرانے موہنجوداڑو کا دیکھو۔ ایک لائن میں بنی ہوئی پکی عمارتیں، سیدھی سڑکیں، انڈر گراؤنڈ سیوریج سسٹم، بارش میں کبھی پانی جمع نہیں ہوا۔ کسی کو ٹھوکر نہیں لگی۔ کوئی نالی میں نہیں گرا۔''

''ٹھوکر اس لیے نہیں لگی کہ موہنجوداڑو میں شراب خانہ نہیں تھا، شرابی نہیں تھے۔'' طاہر نے قہقہہ لگا کر کہا۔

''وہ آرٹسٹ لوگ تھے۔ گریٹ آرٹسٹ۔'' راج نے طاہر کا قہقہہ نظر انداز کر دیا۔ ''آج کے آرکیٹکٹ صرف کرافٹسمین ہیں۔ آرٹ کے لیے من کی شانتی چاہیے۔ وہ ایک دم شانت لوگ تھے۔ آجو باجو ملکوں میں خون خرابا تھا، لیکن انہوں نے کبھی لڑائی نہیں لڑی۔ اپنے کام سے کام رکھا۔ ڈاکٹر! آپ کبھی موہنجوداڑو گئے ہو؟''

''کئی بار! میرے ماں باپ سندھ سے ہیں۔ میں کالج کی چھٹیاں سندھ میں گزارتا تھا۔''

''سائیں تم تو ہمارا بھائی ہے۔ برادر Real Brother''۔ راج اچھل کر اسٹول سے اترا اور ساحل کو گلے لگانے لگا۔ راج کے بعد طاہر اور پھر ڈبلیو نے گلے لگایا۔ انہیں کے پیچھے گہرے کالے رنگ کا ایک شخص آ کھڑا ہوا تھا، وہ بھی ساحل سے گلے ملنے لگا۔ ساحل ادھر ادھر دیکھ کر جھینپتے ہوئے سوچ رہا تھا وہ ان شرابیوں کے درمیان تماشا بننے کیوں آیا ہے۔

''یہ ٹونی ہے، سری لنکا کا ٹائیگر۔'' طاہر نے آنے والے کا تعارف کرایا۔ ''ٹرانسپورٹ کا کام کرتا ہے۔ گریٹ بزنس مین! لکھ پتی ہے سالا لکھ پتی!''

''سنڈے کو ہم مظاہرہ کر رہے ہیں۔'' تعارف ختم ہوا تو ساحل نے ان کی توجہ حاصل کرنا چاہی۔ وہ سوچ رہا تھا کہ اپنا کام کر کے جائے۔ بہت وقت ضائع ہو گیا تھا۔

''Peace March'' طاہر نے ہاتھ اٹھا کر اعلان کیا۔ ''ساؤتھ ایشین پیس مارچ! سب کو آنا ہے۔'' طاہر نے پمفلٹوں کے بنڈل راج اور ڈبلیو کو دیئے۔ ٹونی نے بھی ہاتھ بڑھایا، لیکن طاہر نے دیکھا نہیں یا نظر انداز کر دیا۔

''تم لوگوں کا یہی مسئلہ ہے، ہمیں اپنا حصہ نہیں سمجھتے۔'' ٹونی نے غصے سے کہا۔

''تم ہمارا حصہ نہیں ہو۔ تمہارا رنگ بھی کالا ہے اور تم سری لنکا کے لوگ ہماری زبان بھی نہیں سمجھتے۔'' طاہر نے پلٹ کر جواب دیا۔

''اور ڈبلیو؟ کیا اس کا رنگ کالا نہیں ہے۔ کیا وہ تمہاری زبان بولتا ہے؟''

ڈبلیو اپنی کلائی ٹونی کی کلائی سے ملا کر رنگ کا فرق بتانے لگا۔

''ڈبلیو اردو بول سکتا ہے۔ کیوں ڈبلیو؟ بول کر بتا۔'' طاہر نے ڈبلیو کو امید بھری نظروں سے دیکھا۔

''میرے باپ نے 1971ء میں اردو نہ بولنے کی قسم کھائی تھی۔ میں مجبور ہوں۔''

''سب قسمیں ٹوٹ گئی ہیں، خستہ ہو کر خود بخود بکھر گئی ہیں۔'' طاہر کو مکالمہ بولنے کا موقع مل گیا۔

''آپ ہمارا بہت اٹوٹ حصہ ہیں۔'' ساحل نے اپنے بیگ سے پمفلٹوں کا ایک اور بنڈل نکال کر ٹونی کو دیتے ہوئے کہا۔ ''آپ مظاہرے میں ضرور آیئے گا۔'' ٹونی خوش ہو گیا۔

''آپ نے ڈبلیو کی کہانی سنی ہے؟'' اس نے ساحل سے پوچھا۔

''نہیں!'' ساحل نے پہلے ڈبلیو بول پڑا۔ ''میں آج کہانی نہیں سناؤں گا۔ سالا طاہر رو دے گا۔ اسے اپنے بچے کا دودھ یاد آ جائے گا۔''

''نہیں آئے گا۔'' طاہر نے کہا۔ وہ اس وقت مکمل ترنگ میں تھا۔ ''بچوں کے لیے میں نے دودھ کی نہر کھود دی ہے۔ وہ سالا فرہاد۔ فرہاد نہیں فراڈ۔ وہ شیریں کے لیے دودھ کی نہر نکالنے چلا تھا۔ ابے عورت تو خود دودھ ہے۔ دودھ ہی دودھ۔ اسے دودھ نہیں چاہیے۔ دودھ بچے کی ضرورت ہے۔ میں نے دودھ کی نہر بچوں کے لیے نکالی ہے۔''

''کہانی سنو۔'' ڈبلیو نے کاؤنٹر پر ہاتھ مار کر سب کی توجہ اپنی طرف کھینچ لی۔

''ڈھاکہ میں ایک سوشل ورکر تھی، مس چوہدری۔ وہ چائلڈ لیبر کی ویلفیئر کے لیے کام کرتی اور عوامی تھیٹر بھی لگاتی تھی۔ ایک بار اس نے بہت درد بھری کہانی اسٹیج کی۔ رکشہ چلانے والے ایک بچے کو اپنے بیمار باپ کی دوا خریدنے کے لیے سوا روپے کم پڑ رہے تھے۔ اس نے سوا روپے کی ایک سواری طے کر کے اسے گھر پہنچایا تو مسافر نے اسے صرف ایک روپیہ دیا اور کہا وہ چونّی زیادہ مانگ رہا ہے۔ رکشے والا بچہ بہت گڑگڑایا لیکن کوئی فائدہ نہ ہوا۔ دوسری سواری بہت دیر بعد ملی۔ دوا کے پیسے پورے ہوئے تو دوا کی دکان بند ہو چکی تھی۔ گھر پہنچا تو باپ مر گیا تھا۔ تھیٹر کے آخری سین نے لوگوں کو رلا دیا تھا۔''

ساحل کو کہانی کے انجام پر افسوس ہوا۔ لیکن کہانی ابھی ختم نہیں ہوئی تھی۔ ڈبلیو گھونٹ لے کر دوبارہ شروع ہو گیا۔

''مس چوہدری نے ڈرامہ ختم کرنے کے بعد گھر جانے کے لیے جو رکشا لیا اسے بھی ایک بچہ چلا رہا تھا اور اس سے بھی سوا روپے کا کرایہ طے ہوا تھا، لیکن گھر پہنچ کر مس چوہدری نے بھی صرف ایک روپیہ دیا اور بچے کو ڈانٹ کر بھگا دیا۔ اس بچے کی ماں بیمار تھی اور دوا کے لیے پیسے کم تھے۔ گھر پہنچا تو اس کی ماں بھی مر چکی تھی۔''

''منافق عورت!'' ساحل منہ ہی منہ میں بڑبڑایا۔

''کہانی ختم نہیں ہوئی، پنچ لائن ابھی باقی ہے۔'' طاہر نے اس کے کان میں سرگوشی کی۔

ڈبلیو نے اس بار بڑا سا گھونٹ لیا، اس کی آنکھیں بھیگنے لگی تھیں۔

''وہ بچہ کوئی اور نہیں تھا۔ وہ میں تھا، میں!'' ڈبلیو نے گلاس کی پوری مائع حلق میں اتار لی اور سسکنے لگا۔ سب سے پہلے ٹونی نے اسے گلے لگایا، پھر راج نے اور آخر میں طاہر نے۔

''نہ رو میرے بچے! میرے بچے کو بھی دودھ نہیں ملا، آج کی رات وہ بھوکا سوئے گا۔'' اس کے ساتھ ہی طاہر بھی رونے لگا۔ ٹونی سب کو آنسو پونچھنے کے لیے ٹشو تقسیم کر رہا تھا اس نے طاہر کو تسلی دی۔

''میری ٹرانسپورٹ کمپنی تمہارے بچے کے لیے دودھ حاصل کر کے رہے گی۔''

''وعدہ!'' ٹونی نے جواب میں سر ہلایا تو طاہر نے رونا بند کر دیا۔ اسی وقت پولا جو کاؤنٹر کے دوسرے کونے پر تھی، تیزی سے ان کی طرف آئی۔

''کیا رونے کا ٹائم ختم ہو گیا؟'' ٹونی نے اثبات میں سر ہلایا تو اسے غصہ آ گیا۔ ''میں نے کہا تھا میرا انتظار کرنا، آج مجھے بھی رونا تھا۔''

''کیوں؟ تمہارے بچے کو بھی دودھ نہیں ملا؟''

''نہیں! میرے بچہ ہی نہیں ہے۔'' اس نے منہ بسورتے ہوئے کہا اور رو پڑی۔ اس کے ساتھ ہی کاؤنٹر پر بیٹھے ہوئے سب لوگ رو پڑے۔ ساحل روتے ہوئے شرابیوں کو چھوڑ کر خاموشی سے باہر نکل آیا۔ اسے سیّد پر سخت غصہ آیا تھا جس نے اسے یہاں بھیجا تھا۔ شرابیوں کے ساتھ اس کے چار پانچ گھنٹے خواہ مخواہ ضائع ہوئے تھے۔ ساحل جانتا تھا انہیں صبح اٹھ کر مظاہرے کے بارے میں کیا، یہ بھی یاد نہ رہے گا کہ رات انہوں نے کیا کیا تھا۔

ساحل کا خیال صحیح نہیں تھا۔ اقوامِ متحدہ کے سامنے ہونے والے امن مظاہرے میں جنوبی ایشیا کا سب سے نمائندہ جتھہ انہی لوگوں کا تھا۔ سو سے زیادہ لوگوں کا گروپ تھا جس کے شرکاء چاروں میں سے کسی نہ کسی ایک ملک کا جھنڈا اٹھائے ہوئے تھے۔ وہ سب بہت بردبار اور سنجیدہ لوگ تھے۔ امن کے بارے میں اپنے پمفلٹ خود لکھ کر لائے تھے۔ طاہر ایک ٹورسٹ کو مظاہرے کے بارے میں سمجھاتا ہوا مکالمہ بول رہا تھا۔

''دن کی روشنی کسی بہت چھوٹے سے سوراخ سے طلوع ہو گی۔''

(ناول ''صدرِ محترم'' سے اقتباس)

اشرف شاد کی دیگر تصانیف

بے وطن (ناول)

وزیر اعظم (ناول)

صدرِ محترم (ناول)

نصاب (شاعری)

آ مرے قریب آ (شاعری)

شعرائے آسٹریلیا (ترتیب)

''REPORTING THE THIRD WORLD'' (تحقیق)

<u>زیرِ تحریر</u>

جج صاحب (ناول)

سفرانے (سفرنامے/افسانے)

Love@dot.com (انگریزی کہانیاں)

برقی رابطہ

ashrafshad@hotmail.com

فون: برونائی: +6737120150

سڈنی: +61431029388

مشاہیر کی نظر میں

احمد ندیم قاسمی:

اشرف شاد نے تخلیقی ادب میں سیاسی معاملات کو موضوع بنانے کی روایت کو نئی توانائی دی ہے۔ ادب میں سیاسی موضوعات سے گریز کی وجہ ادیبوں کی اپنی تن آسانی ہے لیکن اشرف شاد نے یہ بات غلط ثابت کردی ہے کہ سیاسی موضوعات ادب کے ممنوعات میں شامل ہیں۔

شوکت صدیقی:

اشرف شاد نے...... معاشرتی تضاد کو بے نقاب کیا ہے اور بے وطن اور وزیر اعظم جیسے ناول لکھ کر اردو ناول نگاری میں منفرد مقام بنالیا ہے۔ جرأت و بے باکی اشرف شاد کے ناولوں کا طرۂ امتیاز ہے اور انھوں نے اپنی تحریروں میں حقائق کا برملا اظہار کرنے میں کسی مصلحت سے کام نہیں لیا۔

منشا یاد:

اشرف شاد کے ناول کشادہ تناظر اور وسیع لینڈ سکیپ رکھتے ہیں اور محض حالات و واقعات کی عکاسی تک محدود نہیں بلکہ ان میں اپنے ملک کو درپیش ہر خطرے، مسئلے اور معروضی صورتِ احوال کا

حقیقت پسندی کے نقطۂ نظر سے جائزہ لیا گیا ہے اور اس پر نہایت سچائی، بالغ نظری اور دانش وری سے اپنی رائے دی ہے۔ ان کی سیاسی، تاریخی اور سماجی معلومات حیران کن ہیں۔

پروفیسر پیرزادہ قاسم:

اشرف شاد...... کمٹ منٹ کے آدمی ہیں۔ انھوں نے تیکھے انداز میں مشکل موضوعات پر مخصوص طریقے سے قلم اٹھایا ہے۔ ایک اچھے تخلیق کار کے لیے باخبری، باضمیری اور بات کو الفاظ کا جامہ پہنانے کی جو صلاحیت چاہیے وہ ان سے پوری طرح مالا مال ہیں۔ وہ اس اعتبار سے بھی بہت کامیاب آدمی ہیں کہ انھوں نے شاعری اور صحافت کے بعد ناول نگاری کا میدان بھی سر کر لیا ہے۔

پروفیسر سحر انصاری:

اشرف شاد نے...... یہ ثابت کر دیا ہے کہ ان میں ایک ناول نگار چھپا ہوا تھا جو اپنے تخلیقی کرب کے حوالے سے خود ہی ظاہر ہوا اور اپنی صلاحیتوں کو منوا لے گیا۔

امجد اسلام امجد:

اشرف شاد نے (اپنے) ناول میں ایک مایوس کن ماضی اور مخدوش مستقبل کے ساتھ ساتھ زمانۂ حال میں روشن، تعمیری، انقلابی اور راست فکرانہ رویوں کی موجودگی کی نشاندہی کی ہے، انھوں نے اس منظر کو نہ صرف مکمل تباہ ہونے سے بچا لیا ہے بلکہ ان آفاق کی طرف سے بھی اشارہ کیا ہے جہاں سے شفق ایک نئے سورج کے طلوع کی نوید مسرت سنا رہی ہے۔

پروفیسر نذیر احمد:

اشرف شاد کے پاس روشنیٔ طبع ہے۔ پردوں کو چاک کر کے چیزوں کو عریاں اور اصلی حالت میں دیکھنے کا حوصلہ ہے۔ منتشر واقعات کو منظم کر کے کہانی پیدا کرنے اور اسے لکھنے کی صلاحیت ہے، زبردست عزم اور لگن ہے۔

شکیل عادل زادہ:

اشرف شاد کا مشاہدہ بہت گہرا ہے اور وہ ممالک جن سے ان کا واسطہ پڑا ہے ان کے سیاسی حالات سے انھیں مکمل آگہی حاصل ہے۔ پاکستان کے سیاسی اور سماجی منظر نامے اور یہاں کے نظامِ فکر و خیال پر بھی ان کی گہری نظر ہے۔ انھیں بہت سی ایسی در پردہ کہانیوں کا علم ہے جو اپنے قاری کو چونکاتی اور اداس کر دیتی ہیں۔

اشرف شاد کے تین شاہکار ناول

بے وطن

آسٹریلیا، بحرین، کویت، ہندوستان اور پاکستان کے پس منظر میں لکھا جانے والا انعام یافتہ ناول

ooo
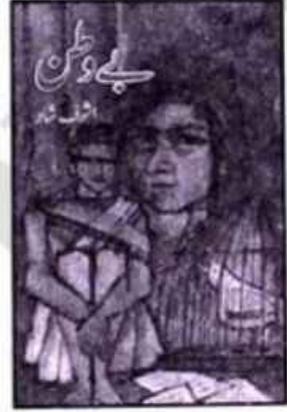
وزیر اعظم

پاکستان میں ہونے والی محلاتی سازشوں اور اونچے ایوانوں میں رہنے والے صدر اور وزرائے اعظم اور فوجی جنرلوں کے قصے۔

ooo

صدرِ محترم

ایک ایسے صدر کی کہانی جو برسرِ اقتدار آکر ایوانِ صدر کو سیاست کا عجائب گھر اور ایک چھوٹے سے مکان کو ایوانِ صدر بنا دیتا ہے، لیکن نیا فوجی سربراہ میزائل چلانے والے بٹن پر انگلی رکھ دیتا ہے۔ ایک دھماکہ ہوتا ہے، دور تک تباہی پھیل جاتی ہے اور پھر...... ایک خیمے میں بیٹھا نیا صدر نئے پاکستان کی بنیاد رکھتا ہے۔
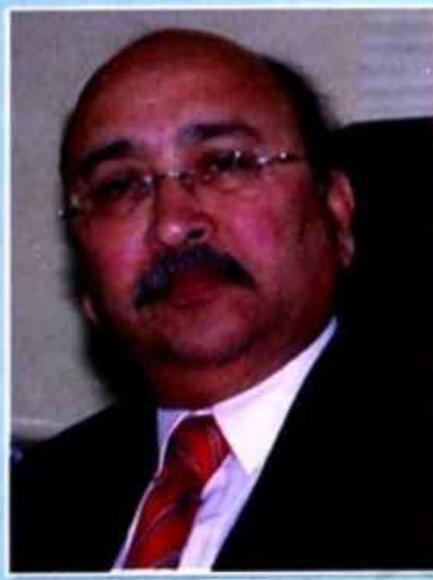
''پہلی لکیر'' اشرف شاد کے افسانوں کا پہلا مجموعہ ہے۔ وہ ناول نگار کی حیثیت سے زیادہ شہرت رکھتے ہیں ان کا پہلا ناول ''بے وطن'' ۱۹۹۸ میں اکادمی ادبیاتِ پاکستان سے وزیراعظم ادبی ایوارڈ حاصل کر چکا ہے۔ ''وزیرِاعظم'' ان کا دوسرا ناول تھا جس میں اقتدار کی میوزیکل چیئر کھیلنے والوں کی کہانیاں تھیں۔ احمد ندیم قاسمی نے ان کے اس ناول پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا تھا: ''سیاسی موضوعات کو ناول کی بنیاد بنانا آسان نہیں ہے۔ یہ کام اشرف شاد جیسا ماہر صحافی ہی کر سکتا تھا جو اس ملک کے اقتدار کے بے رحمانہ کھیل کا نزدیک سے جائزہ لیتا رہا ہے۔'' ان کا تیسرا ناول ''صدرِ محترم'' بھی سیاسی فکشن تھا جسے امجد اسلام امجدؔ نے حقیقت اور تصور کا ایک ایسا عمدہ امتزاج قرار دیا تھا ''جس کا مطالعہ ہمارے شعور و آگہی کے ساتھ ساتھ دردمندی انسانیت اور پاکستان دوستی کے جذبات کو مہمیز کرتا ہے۔''

اشرف شادؔ کہنہ مشق صحافی اور ایک خوش اسلوب شاعر ہیں۔ ان کی شاعری کے دو مجموعے ''نصاب'' اور ''آمرے قریب آ'' شائع ہو چکے ہیں۔ مغربی ذرائع ابلاغ میں تیسری دنیا کی رپورٹنگ کے مسائل پر ان کا تحقیقی مقالہ بھی شائع ہو چکا ہے۔ وہ پچھلے سات آٹھ سال سے متحدہ عرب امارات کی مرکزی یونیورسٹی میں اکیڈیمک ایڈیٹر تھے اور دبئی کی ایک یونیورسٹی میں میڈیا سے متعلق کورسز پڑھاتے تھے۔ اس سے قبل وہ آسٹریلیا میں پندرہ برس ''ایس بی ایس'' ریڈیو سڈنی کی اُردو سروس کے سربراہ تھے ساتھ ہی پاکستان کے انگریزی روزنامہ ''ڈان'' کی نمائندگی کرتے تھے۔ آج کل وہ برونائی میں مقیم ہیں جہاں ان کی اہلیہ برونائی یونیورسٹی میں پروفیسر ہیں اور ذہنی امراض پر ریسرچ کرتی ہیں۔

ISBN: 978-969-496-422-5